يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

افکارِ حق کا ترجمان

البرهان

- سانحہ کربلا
- حق تو یہ ہے
- کیا یزید جنتی ہے؟
- اسلام بمقابلہ عیسائیت
- مقدمہ توہین رسالت (ٹکا دو صاحب)
- اسلام کا نظریہ حدود و تعزیرات
- ان شاء اللہ
- تحقیق تاریخ ولادت و وصال مصطفیٰ ﷺ
- مدینے سے میدان کربلا تک امام حسین رضی اللہ عنہ کی سواری

التحقیقات الاسلامیہ فاؤنڈیشن واہ کینٹ

مجلس مشاورت

صاحبزادہ حافظ محمود احمد
علامہ مفتی سردار علی خان
غلام مصطفیٰ
علامہ مفتی محمد عبد السلام
علامہ مفتی کامران مسعود رضوی
علامہ مفتی محمد ضیاء الرحمن
پیرزادہ محمد جمیل

مجلس ادارت

غلام رسول
سید صابر حسین شاہ بخاری
ابو اسامہ ظفر القادری
سید بادشاہ تبسم بخاری

نمائندگان

مولانا محمد انور رضا قادری (ملتان شریف)
محمد سعید مجاہد آبادی (لاہور)
حافظ محمد طارق قمر (اسلام آباد)
مولانا حافظ ظہور الحق (راولپنڈی)
حافظ فدا حسین رضوی (راولپنڈی)
قاری محمود الحسن (گوجر خان)
حافظ حامد رضا سلطانی (اٹک)
محمد ظفر (واہ کینٹ)

حضرت علامہ پیر عبد القادر ایم اے ایل ایل بی

زیر اہتمام

ظفر محمود قریشی (واہ کینٹ)

قانونی مشیر

صاحبزادہ عبد الغفور ساقی ایم اے ایل ایل بی
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و فیڈرل شریعت کورٹ

نوٹ: نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری مضمون نگار پر ہوگی

Email:alburhanwah@gmail.com

برائے رابطہ: مکتبہ فیضان سنت دکان نمبر 28 میلاد چوک پی او ایف واہ کینٹ
CELL:0343.5942217 0302.5122663

فہرست

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اللّٰھم صلّ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آل سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم وصلی علیہ

اداریہ

!! ایڈیٹر !!

عہد حاضر میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے کوئی بھی باشعور انسان انکار نہیں کرسکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ذرائع ابلاغ انتہائی گہرے اور دور رس اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ حکومتوں کے بنانے اور گرانے میں بھی ان کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ دنیا بھر میں تمام ممالک، قومیں اور عالمی تنظیمیں ان کے ذریعے ہی اپنے اغراض ومقاصد کی تشہیر کررہی ہیں۔ ان سے صرف نظر کرکے تہذیبوں اور معاشروں میں اپنی حیثیت منوانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اس وقت وطن عزیز پاکستان کے طول وعرض میں مختلف طبقہ ہائے فکر کی طرف سے متعدد ادبی، سیاسی اور مذہبی اخبارات، رسائل وجرائد شائع ہورہے ہیں جو کہ ان طبقوں کے افکار ونظریات کی تشہیر کا اہم ذریعہ ہیں۔ ان میں نمایاں حصہ مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل وجرائد کا ہے۔ میرا روئے سخن بھی انہی کی طرف ہے۔

پاکستان میں مختلف مکاتب فکر کی طرف سے لاتعداد مذہبی رسائل وجرائد مطلع صحافت پر جلوہ گر ہیں۔ اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اکثر مجلّے مسلک حقہ اہل سنت وجماعت کے مخالفین کی طرف سے شائع ہورہے ہیں ان میں سے چند ایک ہی ایسے ہوں گے جو کہ اپنی بات مثبت طریقے سے پیش کرتے ہوں ورنہ اکثر اہل سنت وجماعت کے عقائد ومعمولات کے خلاف ہمہ وقت زہر اگلنے میں مصروف ہیں۔ ان کے ذریعے اپنے لوگوں کی اس طرز پر ذہن سازی کی جارہی ہے کہ وہ اہل سنت کے خلاف کسی بھی محاذ آرائی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ بعض نبی علیہ السلام کی عظمت،

رفعت کو گھٹانے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں۔ بعض صحابہ کرام کی شان کو داغدار کرنے کی ناکام کاوش میں مصروف ہیں۔ اہل بیت پاک کی محبت وعقیدت کو مٹانے کی سعی لاحاصل کے ساتھ ساتھ اولیائے کرام کی تعظیم وتکریم کو شرک گردانے میں مگن ہیں۔ بعض کوتاہ فہم لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھو کر ان کو فقہ حنفی سے برگشتہ کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے اشاعتی اداروں کی طرف سے اہل سنت وجماعت کے عقائد ومعمولات کے خلاف چھپنے والی کتابوں کی ایک یلغار ہے جو بکواسات و ہفوات سے پُر ہیں۔ جنھیں پڑھ کر اہل محبت کا خون کھولنے لگتا ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ حالانکہ پاکستان جو ہمارے بزرگوں کی لازوال قربانیوں اور محنتوں کا ثمر ہے ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

دوسری طرف ہمیں یہ چیلنج بھی درپیش ہے کہ ہمارے بعض عاقبت نااندیش صراط مستقیم سے پھسلتے نظر آ رہے ہیں۔ اہل سنت وجماعت کے مسلمہ عقائد ونظریات سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ سلف صالحین کی تحقیقات کو پس پشت ڈال کر اپنی خودساختہ تحقیقات کو منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔ ایسے میں حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ منظم طریقے سے اہل سنت وجماعت کی طرف سے ان تمام فتنوں کا تحمل وبردباری سے مقابلہ کیا جائے۔ مخالفین کے تمام اخبارات اور رسائل وجرائد نیز ان کی کتب میں چھپنے والے نت نئے اعتراضات اور الزامات کا علمی وتحقیقی جواب دیا جائے اور ان کی طرف سے پھیلائے جانے والے باطل نظریات کے تدارک کے لیے جہد مسلسل سے کام لیا جائے۔

اس مقصد کے لیے اگرچہ اس وقت اہل سنت وجماعت کی طرف سینکڑوں کی تعداد میں رسائل وجرائد مختلف شہروں اور قصبوں سے شائع ہو رہے ہیں ان میں بعض رسائل بہت معیاری اور تحقیقی ہیں جو نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی قارئین کا ایک وسیع اور مضبوط حلقہ رکھتے ہیں۔ ان کے مدیران کی ان کاوشوں کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ان میں بعض رسائل اتنے غیر معیاری اور غیر تحقیقی ہیں کہ دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ انکا حلقہ قارئین اتنا محدود ہے کہ وہ اپنے شہر میں بھی اجنبی ہیں۔ یہ صوری ومعنوی خوبیوں سے تہی دامن ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا انداز نگارش ہے کوئی

کسی درگاہ کا ترجمان ہے تو کوئی کسی خانقاہ کا، کوئی کسی تنظیم کا پیامبر ہے تو کوئی کسی شخصیت کی زلف کا اسیر ہے۔

چنانچہ وقت کا تقاضا ہے کہ ایک ایسا معیاری اور تحقیقی مجلہ منظر عام پر لایا جائے جو ظاہری و باطنی خوبیوں سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ دلیل کی قوت سے بھی مالا مال ہو۔ جو چاروں فقہی مسالک اور تمام سلاسل طریقت کا ترجمان ہو۔ جس کی زبان ایسی ہو کہ اس میں اشتعال کی بجائے چاشنی ہو۔ جس میں مخالفین کے علمی تعاقب کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد و معمولات کو قرآن وسنت کے محکم دلائل سے ثابت کیا جائے۔ فقہ حنفی کی ثقاہت سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا جائے خصوصاً حدیث پاک سے ہر مسئلے کا ثبوت پیش کیا جائے۔ نئے نئے موضوعات کو زیر بحث لایا جائے یا پرانے موضوعات کو نئے رنگ میں پیش کیا جائے، اور دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جائے۔ مستشرقین اور سیکولر نظریات کے حامل لوگوں کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔ نیز اہل سنت کی صفوں میں چھپے ان پردہ نشینوں کو بھی بے نقاب کیا جائے جو اہل سنت کے مسلمہ عقائد کو مسخ کر کے اپنے خود ساختہ عقائد کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ملک بھر میں شائع ہونے والے مجلوں اور اخبارات کے کارآمد حوالوں اور شہ پاروں کو محفوظ کر دیا جائے۔

عرصہ سے راقم کی یہ شدید خواہش تھی کہ اس طرح کا کوئی معیاری اور تحقیقی پرچہ سامنے لایا جائے۔ محترم جناب ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی مدظلہ کی بھی یہی خواہش تھی محترم جناب ظفر محمود قریشی صاحب بھی ایسے ہی جذبات دل میں رکھتے تھے۔ چنانچہ جب ہم تینوں مل بیٹھے تو اللہ پاک کے فضل عظیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کرم عمیم کے بھروسے پر یہ کام کر گزرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ "البرہان" کے نام سے مجلہ آپکے ہاتھوں میں ہے۔ مطالعہ کے بعد معزز قارئین سے اور خصوصاً اہل علم سے گذارش ہے کہ اس کے متعلق اپنی آراء سے ہمیں آگاہ فرمائیں اور اپنے قیمتی مشوروں سے بھی ضرور نوازیں۔ میں مشکور ہوں جناب پیر سید صابر حسین شاہ صاحب بخاری اور علامہ سید بادشاہ تبسم بخاری صاحب کا کہ جنھوں نے اپنی قیمتی آراء سے ہمیں مستفیض فرمایا۔

ہمیں حضرت مفکر ملت علامہ پیر عبد القادر صاحب اور اُن کے تلامذہ کی مساعی جمیلہ کا

اعتراف بھی ہے اور احترام بھی، حضرت علامہ پیر سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب اور دیگر علمائے اہل سنت کی خدمات کو بھی ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں ان سب حضرات کی دعاؤں اور مشوروں کی ضرورت رہے گی۔ دعا ہے اللہ کریم ہمیں اپنے مقاصد میں کامیاب وکامران فرمائے۔ آمین!

محمد افضل شاہد (ایڈیٹر امرازی)
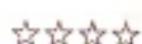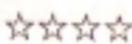
☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

سانحہ کربلا

شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی قادری ☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی حبیب اللہ وعلی الہ واصحابہ اجمعین

سیدنا امام حسین ؓ نے اب تلوار کیوں اٹھائی اور پہلے کیوں نہ اٹھائی تھی:؟

سیدنا امام حسین ؓ نے تمام خلفاء راشدین کے دور میں، حتیٰ کہ حضرت سیدنا امیر معاویہ ؓ کے زمانے تک کسی حکومت کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی بلکہ اطاعت گزاری کو اختیار کیے رکھا۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کے دور حکومت میں سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہما دونوں حضرت امیر معاویہ ؓ کے پاس شام میں آیا جایا کرتے تھے اور حضرت امیر معاویہ ؓ ان دونوں شہزادوں کا بہت احترام فرماتے تھے۔ انکی خدمت میں بہت سے عطیات اور وظائف پیش کرتے تھے اور دونوں شہزادے انہیں بخوشی قبول فرماتے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۵۸)۔

حضرت داتا صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت سیدنا امام حسین ؓ کے پاس ایک غریب آدمی نے آکر خیرات مانگی۔ آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ ہمارا وظیفہ آنے والا ہے، جیسے ہی وظیفہ پہنچ جائے گا آپ کو دے دیا جائے گا۔ تھوڑی دیر میں حضرت امیر معاویہ ؓ کی طرف سے ایک ایک ہزار دینار کی پانچ تھیلیاں پہنچ گئیں۔ تھیلیاں پہنچانے والوں نے عرض کیا کہ حضرت امیر معاویہ نے معذرت کی ہے کہ یہ تھوڑی سی رقم ہے اسے قبول فرمائیں۔ سیدنا امام حسین ؓ نے ساری رقم اس غریب آدمی کے حوالے کردی اور اس سے معذرت چاہی (کشف المحجوب صفحہ ۷۷)۔

حضرت امیر معاویہ ؓ نے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا یا نہیں؟ اسکے بارے میں دو قول

☆ 048-3215204

موجود ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ آپ نے اسے ولی عہد مقرر نہیں کیا بلکہ اس نے خود بخود حکومت سنبھال لی تھی۔ یہ بات علامہ ابو الشکور سالمی رحمت اللہ علیہ (متوفی پانچویں صدی) نے اپنی مایہ ناز کتاب التمہید کے صفحہ ۱۶۹ پر بیان فرمائی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یزید کو ولی عہد مقرر کرنے کے لیے حضرت امیر معاویہ نے مختلف اکابر سے مشورہ لیا تھا۔ کچھ لوگ اس تجویز سے متفق ہو گئے جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم اس بات سے متفق نہیں تھے۔ یہ سب باتیں شیعہ کی کتاب (تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۹) پر اور اہل سنت کی کتاب (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۵۸) پر درج ہیں۔ نیز مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید سے کہا تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اچھا رویہ اختیار رکھنا فصل رحمه واوفق به (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۶۹ اور شیعہ کی کتاب جلاء العیون صفحہ ۳۸۸ فصل دوازدہم)۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے یزید کے کرتوتوں سے آگاہ نہیں تھے۔ اور اگر کوئی چھوٹی موٹی خرابی آپ کے علم میں تھی بھی تو آپ نے یہ سوچ کر یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا کہ جب ذمہ داری سر پر آئے گی تو انسان بن جائے گا۔ مگر یزید نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہی عراق کے شیعہ لوگوں نے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت امیر معاویہ کے خلاف اکسایا تھا مگر آپ رضی اللہ عنہ نے شیعوں کی اس بات کو قبول نہ فرمایا اور صبر سے کام لینے کا حکم دیا ایشان را محاب ننمود و بصبر امر کرد (شیعہ کی اپنی کتاب جلاء العیون صفحہ ۳۲۸)۔ یہی بات شیعہ کے مشہور عالم شیخ مفید نے اپنی کتاب الارشاد کے صفحہ ۱۸۲ پر عربی زبان میں لکھی ہے فاتبع علیهم و ذکر ان بینه و بین معاوية عهدا و عقدا لایجوزله نقضه حتی تقضی المدة (الارشاد ۱۸۲)۔ غور فرمائیے! آخر کیا بات ہے کہ سن ۶۰ ہجری تک سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے تمام خلفاء علیہم الرضوان کی تابعداری کو قبول کیے رکھا مگر سن ۶۱ ھ میں جب یزید کی باری آئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے تلوار کھینچ لی؟

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی مایہ ناز کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ "تا حق ظاہر بود مر حق را متابع بود و چوں حق مفقود شد شمشیر بر کشید" یعنی جب تک حق ظاہر تھا امام

حسین رضی اللہ عنہ حق کے تابع رہے۔ مگر یزید کے دور میں حق رخصت ہو گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے تلوار کھینچ لی (کشف المحجوب صفحہ ۷۶)۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا عمل اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ چاروں خلفاء راشدین اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے ہر ایک کے ساتھ امام عالی مقام متفق تھے۔ اسی لیے ان کے تابع رہے اور ان سے وظیفہ بھی قبول فرماتے رہے۔ مگر یزید سے متفق نہ تھے اسی لیے اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

کوفیوں کی طرف سے خطوط:

کوفہ کے شیعوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بے شمار خط لکھے اور عرض کیا کہ آپ کوفہ میں تشریف لائیں آپ ہی ہمارے امیر ہیں۔ ہم نے یہاں کے حکمرانوں کی اطاعت چھوڑ رکھی ہے اور کوفہ کے والی نعمان بن بشیر کے پیچھے جمعہ تک ادا نہیں کرتے (الاصابہ جلد ۱ صفحہ ۳۳۲ تحت حسین بن علی، شیعہ کی کتاب جلاء العیون صفحہ ۳۵۶)۔

فبعث اهل العراق الی الحسین الرسل والکتب یدعونه الیهم (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۶۵)۔ جلاء العیون میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ وسائر شیعان او از مومنان و مسلمانان اهل کوفه یعنی یہ خط کوفہ کے تمام حسینی شیعوں کی طرف سے ہے (جلاء العیون صفحہ ۳۵۶)۔

یزید نے حکومت سنبھالتے ہی اہل مدینہ سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ خصوصاً سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا صدیق اکبر کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت لینے پر زیادہ زور دیا تا کہ ان دونوں معتبر ہستیوں کے بیعت کر لینے کے بعد باقی اہل مدینہ کے لیے بیعت کا راستہ آسان ہو جائے۔ مگر ان دونوں مقدس ہستیوں نے بیعت نہ کی بلکہ راتوں رات مدینہ طیبہ سے نکل کر مکہ شریف چلے گئے۔ فبعث الی الحسین و ابن الزبیر فی اللیل و دعاهما الی بیعة یزید فقالا نصبح و ننظر فیما یعمل الناس و وثبا فخرجا (سیر اعلام النبلاء للذہبی جلد ۳ صفحہ ۱۹۸)۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مشورہ:

کوفہ کے شیعوں کی طرف سے اس قدر بے تحاشا خطوط آنے کے بعد امام عالی مقام سیدنا حسین ؓ جیسی ذمہ دار ہستی کے پاس لبیک کہنے کے سواہ کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی آپ ؓ نے صحابہ کرام اور اکابر امت علیہم الرضوان سے مشورہ فرمایا اور انہیں کوفیوں کے خطوط کے انبار دکھائے۔

اسکے باوجود صحابہ کرام علیہم الرضوان بلکہ بعض اہل بیت اطہار نے بھی آپ ؓ کو کوفہ جانے سے منع فرمایا۔ منع کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، امام عالی مقام کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت جابر، حضرت ابو سعید اور حضرت ابو بکر بن عبدالرحمن بن حارث علیہم الرضوان جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ ان بزرگوں کے بیانات سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۱۹۷، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۲ اور المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۵ صفحہ ۹۷-۹۶ وغیرہ پر موجود ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کے سگے چچازاد بھائی اور سیدنا امام حسین ؓ کے چچا حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا یہ فرمان ملاحظہ فرمایئے۔ آپ ؓ فرماتے ہیں۔

جآء نی حسین یستشیر نی فی الخروج الی ماھہنا یعنی العراق فقلت لولا ان یزروا بی وبک لشبثت یدی فی شعرک. الی این تخرج؟ الی قوم قتلوا اباک وطعنوا اخاک ؟ یعنی میرے پاس حسین آئے اور عراق جانے کے بارے میں مجھ سے مشورہ لیا۔ میں نے کہا کہ میرا بس چلے تو میں آپ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر عراق جانے سے روک دوں۔ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اس قوم کی طرف جس نے آپ کے والد ماجد کو شہید کیا اور بھائی کو نیزہ مارا ؟ (المصنف جلد ۱۵ صفحہ ۹۶۔۹۷، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۶۲)۔

سیدنا امام حسین ؓ کے بھائی محمد بن حنفیہ ؓ نے مشورہ دیا کہ آپ کا عراق جانا درست نہیں مگر امام حسین ؓ نے ان کا مشورہ قبول نہ فرمایا۔ اس کے بعد محمد بن حنفیہ ؓ نے اپنی اولاد کو ساتھ جانے سے روک دیا جس کی وجہ سے سیدنا امام حسین ؓ اپنے بھائی محمد بن حنفیہ سے ناراض ہو گئے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۲)۔

شرعی مسائل:

ظالم حکمران کے خلاف کارروائی کرنا شرعاً فرض نہیں بلکہ حق واضح کرنے کے بعد اس سے جان چھڑا کر خاموش ہو جانے کی اجازت ہے۔ اس اجازت کو شریعت کی زبان میں رخصت کہا جاتا ہے۔ اسکے برعکس اگر کوئی بلند ہمت اور بلند رتبہ شخصیت ظالم حکمران کے خلاف ڈٹ جائے تو شریعت اس بات کی بھی اجازت دیتی ہے۔ ظالموں کے خلاف ڈٹ جانے کی اس اجازت کو شریعت کی زبان میں عزیمت کہا جاتا ہے۔ عزیمت کا معنی ہے ''مضبوط اور پختہ ارادہ''۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان نے امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو عراق جانے سے منع فرمایا۔ وہ رخصت پر عمل کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس کے برعکس سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے عراق جانا پسند فرمایا۔ آپ اپنے مقام اور مرتبے کے لحاظ سے عزیمت کو ترجیح دے رہے تھے۔ دونوں طرف کے فیصلے میں کوئی عیب نہیں۔ یہ بھی حق ہے اور وہ بھی حق ہے۔ اجتہادی مسائل میں اختلاف ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

شیعہ حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے امام پاک رضی اللہ عنہ کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ اس کے برعکس خارجی حضرات امام حسین رضی اللہ عنہ پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ منع کرنے کے باوجود باز کیوں نہ آئے۔ الحمد للہ ہم نے ثابت کر دیا کہ اہل تشیع اور خارجی دونوں بے ادب اور گستاخ ہیں اور امام حسین اور صحابہ کرام علیہم الرضوان دونوں حق پر ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ خواہ کوفہ جائیں یا مکہ شریف میں رہیں۔ جام شہادت نوش کرنا ہمارا مقدر ہے۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ نے مکہ شریف میں شہید ہو کر یزید کو مکہ کی بے حرمتی کرنے کا موقع نہ دیا۔ بلکہ کوفہ کی طرف بڑھ کر شہادت کو گلے لگایا۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ امام پاک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فقال لان اقتل بمكان كذا و كذا احب الى من ان اقتل بمكة وتستحل بى یعنی میرا کسی دوسری جگہ پر قتل ہونا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ میں مکہ میں قتل کیا جاؤں اور مکہ کی بے حرمتی ہو (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۲)۔

تیسری بات یہ ہے کہ کوفہ کے شیعوں نے جس قدر خطوط لکھے تھے اگر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اب بھی ظالم حکمران کے خلاف عوامی دعوت کو قبول نہ فرماتے تو کوئی لوگ قیامت کے دن امام پاک کے

خلاف بیان بازی کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ ؓ نے اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری سمجھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مکمل سوچ بوجھ اور مشورے کے بعد جب آپ نے ایک عزم اور ارادہ کر لیا تو اپنے عزم پر ڈٹ گئے۔ اللہ پر توکل کرنے والوں کا یہی طریقہ ہوا کرتا ہے۔ اللہ کریم فرماتا ہے: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ یعنی ان سے مشورہ کریں اور جب کوئی عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کرتے ہوئے ڈٹ جائیں (آل عمران:۱۵۹)۔

پانچویں بات یہ ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے مشورے کو آپ ؓ نے مکمل طور پر نہیں پھینکا بلکہ پہلے احتیاطاً اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو کوفہ بھیجا تاکہ اگر کوفہ والے حضرت مسلم ؓ سے بے وفائی کریں تو ان کا شرعی طور پر منہ بند ہو جائے اور اگر وفا کریں تو صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مطمئن کیا جا سکے۔

حضرت مسلم بن عقیل کی روانگی:

سیدنا امام حسین ؓ نے کوفہ کے حالات کا جائزہ لے کر اطلاع دینے کے لیے اپنے چچازاد بھائی اور بہنوئی حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو روانہ فرمایا۔ جب وہ کوفہ پہنچے تو تقریباً بارہ ہزار کوفیوں نے آپ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کر لی (الاصابہ جلد ا صفحہ ۳۳۲)۔

آپ نے حالات سے مطمئن ہو کر سیدنا امام حسین ؓ کو اطلاع دی کہ کوفہ کے حالات ہمارے لیے سازگار ہیں۔ آپ جلد تشریف لے آئیں۔ اس وقت کوفہ کے والی نعمان بن بشیر تھے۔ جب یہ اطلاع سیدنا امام حسین ؓ کو پہنچ گئی تو کوفہ میں حکومت کے حامیوں نے کوفہ کے والی تک حضرت مسلم بن عقیل ؓ کے خلاف شکایت پہنچائی مگر کوفہ کے والی نعمان بن بشیر نے نرمی سے کام لیا اور حضرت مسلم کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس پر حکومت کے حامیوں نے یزید کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ یزید نے فوراً نعمان بن بشیر کو برطرف کر دیا اور اس کی جگہ بصرہ کے والی عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ حضرت مسلم بن عقیل نے حضرت ہانی بن عروہ کے گھر میں قیام کر رکھا تھا۔ تمام کوفیوں نے حکومت کے خوف سے حضرت مسلم بن عقیل کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابن زیاد نے حضرت مسلم اور ہانی بن عروہ رضی

اللہ عنہما کو شہید کر دیا (طبقات ابن سعد جلد ۴ صفحہ ۲۹ تحت عقیل بن ابی طالب)۔ ادھر سیدنا امام حسین ؓ کو اس واقعہ کی کوئی خبر نہ تھی۔

سیدنا امام حسین ؓ کی روانگی:

حالات کو سازگار سمجھتے ہوئے حضرت سیدنا امام حسین ؓ تقریباً اسی (۸۰) افراد کا قافلہ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ واقعہ ۳ ذوالحج سنہ ۶۰ھ کا ہے۔ ادھر اسی روز حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو شہید کر دیا گیا تھا۔

کوفہ جاتے وقت راستے میں امام حسین ؓ کو حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کی افسوسناک خبر ملی۔ اسی راستے میں مختلف لوگوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ ان میں بشیر بن غالب، عبید اللہ بن مطیع اور اہل بیت کے مداح اور مشہور شاعر فرزدق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے سیدنا امام حسین ؓ کو آگے جانے سے منع فرمایا۔ فرزدق نے کہا کہ کوفہ والوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں یزید کے ساتھ ہیں۔

یہ حالات سننے کے بعد امام حسین ؓ کے ساتھیوں میں مختلف خیالات پیدا ہو گئے۔ ایک مرتبہ آپ ؓ نے بھی واپسی کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ لیکن حضرت مسلم بن عقیل ؓ کے بھائی نے فرمایا کہ ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ طویل گفتگو کے بعد یہی طے پایا کہ کوفہ جانا چاہیے۔ جب قافلہ کوفہ کے قریب پہنچا تو حر بن یزید سے ملاقات ہوئی۔ حر کے ساتھ ایک ہزار فوجی سوار تھے۔ اس نے امام حسین ؓ سے عرض کیا کہ میں آپ کا خیر خواہ اور وفادار ہوں مگر سرکاری ملازمت میری مجبوری ہے۔ مجھے ابن زیاد نے آپ کو گرفتار کر کے اسکے پاس لانے کا حکم دیا ہے۔ میں آپکے ادب و احترام کی وجہ سے آپ کو گرفتار نہیں کرتا۔ لیکن آپ بھی میرے حال پر مہربانی فرمائیں اور کوفہ میں داخل نہ ہوں۔ مجبوراً سیدنا امام حسین ؓ کو کوفہ میں داخل ہونے کی بجائے قریب ہی میدان کربلا میں پڑاؤ ڈالنا پڑا۔

عبید اللہ بن زیاد نے اہل بیت اطہار علیٰ جدہم وعلیہم الصلوٰۃ والسلام سے جنگ کرنے کے لیے عمرو بن سعد کو ایک ہزار مسلح گھڑ سواروں کے لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ ابن زیاد نے بعد میں مزید کمک

بھی بھیجی اور اس کے لشکر کی تعداد تقریباً بائیس ہزار تک پہنچ گئی۔

گنتی کے مقدس افراد کا مقابلہ کرنے کے لیے اس لاتعداد لشکر کا پہنچ جانا ان لشکریوں کی بزدلی اور اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کی عظمت و شجاعت کا زندہ ثبوت ہے۔ پھر اس پر بھی بس نہیں۔ کوفی فوج کو اس قدر خوف تھا کہ اتنی کثرت کے باوجود باقاعدہ جنگی تدبیریں اور حکمت عملیاں اختیار کی گئیں۔ تین دن تک پانی بند کر دیا گیا۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کسی صورت بھی جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے اور خصوصاً تلوار چلانے میں پہل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جو حالات نظر آ رہے تھے ان حالات میں مخالفین پر حجت قائم کرنے کی غرض سے آپ نے فرمایا میری تین باتوں میں سے کوئی ایک بات تسلیم کرلو۔

۱۔ مجھے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی بجائے اسلامی سرحدوں پر جا کر کفار کے خلاف جہاد کرنے دو۔

۲۔ یا مجھے مدینہ شریف جانے دو۔

۳۔ یا یزید سے میری ملاقات کرا دو۔ تاکہ میں اس سے خود بات کر کے مصالحت کی صورت نکال سکوں (الاصابہ جلد اصفحہ ۳۳۳، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۰۴)۔

عمرو بن سعد نے یہ باتیں ابن زیاد تک پہنچا دیں۔ مگر ابن زیاد نے ان میں سے ایک بات کو بھی قبول نہ کیا اور امام حسین سے بیعت کا مطالبہ کرتا رہا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے بیعت سے انکار فرما دیا جس پر کوفیوں نے جنگ چھیڑ دی۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی راتوں کو نمازیں پڑھتے، استغفار اور دعائیں کرتے اور اللہ کی بارگاہ میں عاجزی پیش کرتے رہتے تھے اور دشمنوں کے گھوڑے ان کے اردگرد گھومتے رہتے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۵)۔

دسویں محرم کو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے غسل فرمایا اور زبردست خوشبو لگائی اور بعض دوسرے ساتھیوں نے بھی غسل فرمایا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۵)۔ جنگ شروع ہوئی۔ کربلا کے اردگرد کے مسلمانوں کو جب اس جنگ کی خبر ہوئی تو بہت سے لوگ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے کے لیے

میدان میں آگئے اور امام پاک پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ سیدنا حضرت حُر بن یزید رضی اللہ عنہ نے بھی یزیدی لشکر کو خیر باد کہہ دیا اور سیدنا امام حسین سے پہلے جام شہادت نوش فرمایا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۸)۔

جنگ کے دوران جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دشمنوں سے کہو جنگ روک دیں تاکہ ہم نماز ادا کرسکیں **دخل علیهم وقت الظهر فقال الحسين رضي الله عنه مروهم فليكفوا عن القتال حتى نصلي** (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۰)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سمیت نماز خوف ادا فرمائی۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بھائی اور مولا علی رضی اللہ عنہ کے شہزادے حضرت ابو بکر بن علی، حضرت عمر بن علی، حضرت عثمان بن علی اور حضرت عباس بن علی علیہم الرضوان بھی باری باری شہادت سے سرفراز ہوئے۔ مولا علی رضی اللہ عنہ کے ان تمام شہزادوں کے نام شیعوں کی اپنی کتاب جلاء العیون کے صفحہ ۴۱۴ پر اور بہتر تارے کے صفحہ ۹۸، ۱۰۷، ۱۱۱ پر موجود ہیں اور اہل سنت کی کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۷ وغیرہ پر بھی موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ (علی اصغر) جو شیر خوار بچے تھے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ خیمے کے دروازے پر انہیں اپنی گود میں لے کر بیٹھے۔ انہیں بوسے دیئے، الوداع کہنے اور اپنے گھر والوں کو وصیت کرنے لگے۔ بنی اسد کے ایک ظالم شخص نے جس کا نام ابن موقد النار تھا، انہیں تیر مار دیا جو ان کی گردن مبارک میں آکر لگا اور ننھے شہزادے نے جام شہادت نوش کر لیا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۴)۔

بالآخر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کے لشکر کا تنہا مقابلہ فرمایا۔ اپنے کثیر التعداد بھائیوں، جگر کے ٹکڑوں اور ہمراہیوں کی شہادت کا منظر اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھ چکنے کے باوجود سیدنا امام حسین صبر و استقامت کا پیکر تھے۔ ہمت و شجاعت کی وہ مثال قائم فرمائی کہ جس طرف بھی آپ [illegible] بڑھتا تھا آپ دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے چلے جاتے تھے۔ جب لاتعداد کوفیوں کو ٹھکانے لگا چکے تو کوفیوں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ فرد واحد ہم ہزاروں کا خون کر ڈالے مل کر حملہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ

ان سب نے یک بارگی تیروں کی برسات کر دی۔ سیدنا امام حسین ؓ نے جام شہادت نوش فرمایا اور آپ کا جسم اطہر [illegible] کی پشت سے زمین پر آ گیا۔ سنان بن عمرو، یا شاید خولی بن یزید، یا شاید شمر بن ذی الجوشن نے آگے بڑھ کر آپ ؓ کے سر مبارک کو تن سے جدا کر دیا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۵)۔

سیدنا امام حسین ؓ نے دس محرم سنہ ۶۱ ھ جمعہ کے دن شہادت پائی۔ آپ کی عمر شریف چھپن سال پانچ ماہ پانچ دن تھی۔ کربلا میں سیدنا امام حسین ؓ کے بہتر ساتھی شہید ہوئے جبکہ یزیدی فوج کے اٹھاسی افراد قتل ہوئے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۷)۔

میدان کربلا سے بچ کر آنے والوں میں صرف ایک نوجوان حضرت سیدنا امام زین العابدین ؓ تھے جو طبیعت مبارک کی ناسازی کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ باقی سب اہل بیت اطہار خواتین تھیں۔ جن میں حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا نام نامی اسم گرامی سر فہرست ہے۔ آپ سیدنا امام حسین ؓ کی سگی بہن تھیں۔

واقعہ کربلا کے بعد:

ابن زیاد نے آپ کے سر مبارک کو کوفہ کے بازار میں پھرایا۔ کوفہ کے شیعوں نے رو رو کر کہرام برپا کر دیا۔ شیعوں کی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ کوفہ والوں کو روتا ہوا دیکھ کر سیدنا امام زین العابدین ؓ نے فرمایا کہ ان ھولاء یبکون علینا فمن قتلنا غیرھم یعنی یہ سب خود ہی ہمارے قاتل ہیں اور خود ہی ہم پر رو رہے ہیں (احتجاج طبرسی جلد ۲ صفحہ ۲۹)۔

حضرت سیدہ طاہرہ زینب صلوۃ اللہ علی جدہا وعلیہا نے فرمایا کہ تم لوگ میرے بھائی کو روتے ہو؟ ایسا ہی سہی۔ روتے رہو۔ تمہیں روتے رہنے کی کھلی چھٹی ہے۔ کثرت سے رونا اور کم ہنسنا۔ یقیناً تم رو کر اپنا کالا پن چھپا رہے ہو۔ جب کہ یہ بے عزتی تمہارا مقدر بن چکی ہے۔ تم آخری نبی کے لخت جگر کے قتل کا داغ آنسوؤں سے کیسے دھو سکتے ہو جو رسالت کا خزانہ ہے اور اہل جنت کے جوانوں کا سردار ہے (احتجاج طبرسی جلد ۲ صفحہ ۳۰)۔ اسی طرح شیعہ کی کتاب مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ کوفہ کے لوگ

شیعہ تھے (مجالس المومنین جلد ۱ صفحہ ۵۶)۔

اس کے بعد ابن زیاد نے آپ ﷜ کے سر مبارک کو اسیران اہل بیت کے ساتھ شمر کی نگرانی میں یزید کے پاس شام بھیج دیا۔ یزید نے جب سر مبارک کو دیکھا تو بہت رویا اور اپنے منہ پر طمانچے مارے (شیعوں کی اپنی معتبر کتاب جلاء العیون صفحہ ۴۴۵)۔

سیدنا امام حسین ﷜ کی شہادت پر یزید رویا اور آپ کے قاتلوں پر لعنت بھیجی (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۹)۔

یزید نے اہل بیت اطہار کی مقدس خواتین رضی اللہ عنھم کو اپنے گھر دار الخلافہ میں بھیجا۔ یزید کے گھر کی خواتین نے ان کا استقبال کیا اور یزید کے گھر والوں نے تین دن تک رونے دھونے اور نوحہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۰۲)۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوا کہ امام حسین ﷜ کے قاتل بھی شیعہ تھے اور ماتم کی ابتداء کرنے والے بھی شیعہ تھے اور ان ماتم کرنے والوں میں یزید اور اس کا خاندان بھی شامل تھا۔ اب اگر امام حسین ﷜ کے غم میں رونے یا ماتم کرنے سے بخشش ہو جاتی ہے تو پھر بخشش کا سرٹیفکیٹ کوفیوں کو بھی مل جائے گا اور یزید کو بھی مل جائے گا۔ یزید نے آپ ﷜ کے سر مبارک کو اور اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کو مدینہ شریف میں اپنے نائب عمرو بن سعید کے پاس بھیجا اور اس نے سر مبارک کو کفن دے کر جنت البقیع میں سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پہلو میں دفن کر دیا (طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۱۷۶، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۱۱)۔ گویا دھڑ مبارک کربلا میں اور سر مبارک مدینہ منورہ میں دفن ہے۔

سیدنا امام حسین ﷜ کی شہادت کے بعد مدینہ شریف کے لوگوں نے یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ مدینہ شریف کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے یزید کی اطاعت کو اس طرح اتار کر پھینک دیا ہے جس طرح یہ جوتا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ پر جوتوں کا ڈھیر لگ گیا۔ یزید کی فوج نے بے حیائی کی انتہا کر دی۔ امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ یزید کی فوج نے سات سو صحابہ کرام کو شہید کر دیا جن میں مہاجرین اور انصار شامل تھے اور ان کے علاوہ دس ہزار موالی، آزاد اور غلام تابعین شہید کر دیے جنہیں

میں نہیں پہچانتا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۲۹)۔

تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کو حرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ کربلا کے واقعہ سے بھی بڑھ کر ظالمانہ ہے۔ اور یہ واقعہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی عظمت اور اہل بیت سے ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ماتم کی ابتداء: سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے پہلے وصیت فرمائی تھی کہ میری شہادت کے بعد ماتم نہ کیا جائے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۵)۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ماتم کی ابتداء یزید اور اس کے اہل خانہ کی طرف سے اسی وقت کر دی گئی تھی، لیکن بعد میں ماتم کو باقاعدہ مذہبی عبادت کے طور پر ایک شیعہ حکمران معز الدولہ نے بغداد میں سن ۳۵۲ھ میں رائج کیا اور دس محرم کو بازار بند کر کے ماتم کرنے اور منہ پر طمانچے مارنے کا حکم دیا۔ اور شیعہ کی خواتین کو چہرے پر کالک ملنے، سینہ کوبی اور نوحہ کرنے کا حکم دیا۔ اہل سنت ان لوگوں کو منع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اس لیے کہ حکمران شیعہ تھا (شیعوں کی کتاب منتہی الآمال جلد ۱ صفحہ ۴۵۲، تتمۃ المنتہی صفحہ ۳۹۱ اور اہل سنت کی کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۲۶۰)۔

صرف رونا جائز ہے یا نہیں؟:

بعض عوام یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ماتم کرنا ہی منع ہے۔ انکے خیال میں رونے دھونے کی حد تک غم حسین منانا جائز بلکہ کار ثواب اور بخشش کا ذریعہ ہے۔ اسکا جواب اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

کسی پیارے کی وفات پر وقتی طور پر رونا آ جانا محبت اور رحم کے جذبے کا نتیجہ ہے اور یہ بالکل درست اور جائز ہے۔ یہی وہ رونا ہے جس کی احادیث میں صاف اجازت موجود ہے خواہ فوت ہونے والا کوئی بھی ہو۔ لیکن ہر سال کے بعد رونے رلانے بیٹھ جانا ایک عجیب حرکت ہے یہ کام نہ اپنوں کے حق میں جائز ہے اور نہ دوسروں کے حق میں۔ اس دنیا میں ہر کسی کے بہن بھائی، ماں باپ، اولاد اور رشتہ دار فوت ہوتے رہتے ہیں، مرشد اور استاد فوت ہوتے رہتے ہیں، ان سب کے لیے ایصال ثواب کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے مگر سال کے سال رونے کا دھندا نہیں کیا جاتا۔

واقعہ حرہ میں مدینہ منورہ میں سات سو صحابہ کرام علیہم الرضوان کا قتل عام ہوا۔ حضرت مولا علی ﷜ کو رمضان شریف میں بھوکے پیاسے شہید کر دیا گیا۔ حضرت عثمان غنی ﷜ کو چالیس دن تک ان کے گھر میں محصور کر کے اور ان کا پانی بند کر کے پیاس کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ حضرت عمر فاروق ﷜ کو مسجد نبوی میں نماز پڑھتے ہوئے چھرا مار کر شہید کر دیا گیا۔ ظلم کی یہ داستانیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے موقع پر ہم سال کے سال نہ ماتم کرتے ہیں اور نہ روتے ہیں۔

سب کچھ چھوڑیے۔ احادیث میں آتا ہے کہ دنیا کا سب سے تاریک دن وہ تھا جس دن حبیب کریم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اگر ہر سال غم منانا اور رونا رلانا جائز ہوتا تو اللہ کی عظمت کی قسم ربیع الاول کو ہر سال اس دنیا میں کہرام برپا ہو جایا کرتا۔ اب ہم ہر سال میلاد مصطفی ﷺ کی خوشی تو ضرور مناتے ہیں مگر عین اُسی دن (سوموار کو) حضور نبی کریم ﷺ کا وصال شریف بھی ہوا تھا ہم اس کی وجہ سے نہ ماتم کرتے ہیں اور نہ ہی صرف روتے ہیں۔

اہل سنت پر امام حسین ﷜ سے عدم محبت کا الزام لگانے والے غور کریں کہ اہل سنت کی مصطفی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کو تو کوئی مائی کا لال چیلنج نہیں کر سکتا۔ آخر حضور کے وصال کے موقع پر اہل سنت کیوں نہیں روتے؟ یہاں سے بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہر سال رونے لگ جانا واقعی ایک نامعقول اور غیر شرعی حرکت ہے اور جو لوگ سنی کہلانے کے باوجود ہر سال یہ دھندا کرتے ہیں انہیں روافض کا ٹیکہ لگ چکا ہے۔ اللہ کے پیاروں کا طریقہ تو یہ ہے کہ پیاروں کی عین وفات کے دن بھی صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور آنسوؤں پر بھی کنٹرول رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ہاں البتہ بے اختیار آنسو نکل آنا ایک الگ بات ہے۔

مولا علی ﷜ محبوب کریم ﷺ کو غسل دے رہے تھے اور فرما رہے تھے: یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ کی وفات سے ہم نبوت غیب کی باتوں اور آسمان کی خبروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس مصیبت کے سامنے دوسری تمام مشکلات آسان نظر آ رہی ہیں اور ہر شخص اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ اگر آپ نے ہمیں صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور بے تابی سے منع نہ فرمایا ہوتا تو ہم آپ پر رو رو کر

اپنی آنکھوں کا سارا پانی ختم کر دیتے۔ آپ سے جدائی کا درد اور اندوہ ہمیشہ ہمارے سینے میں رہے گا۔ آپ کے دکھ کے سامنے کسی دوسرے دکھ کی کوئی اوقات نہیں۔ کیا کریں، فوت ہونے والوں کو واپس نہیں بلایا جا سکتا اور موت کو واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔ میرے ماں باپ فدا ہوں، اپنے رب کے پاس جا کر ہمیں یاد رکھنا اور خود بھی ہم پر نظر رکھنا (نہج البلاغہ صفحہ ۳۳۶ مطبوعہ ایران/قم)۔

اس خطبے کو بار بار پڑھیے۔ یہ خطبہ ہم نے مکمل نقل کر دیا ہے۔ اس کے اول یا آخر سے کچھ نہیں چھوڑا۔ اس خطبے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مولا علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے محبوب کی عین وفات کے موقع پر بھی آنسوؤں پر کنٹرول رکھا ہے۔ چہ جائیکہ ہر سال کے بعد دوبارہ رونے دھونے کا کام شروع کر دیا جائے۔

حبیب کریم ﷺ نے فرمایا: تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ یعنی موت مومن کے لیے تحفہ ہے (مشکوٰۃ صفحہ ۱۴۰)۔ آپ خود سوچیے کہ جب سادہ سی موت مومن کے لیے تحفہ ہے تو پھر شہادت کی موت کتنا بڑا تحفہ اور کتنا بڑا اعزاز ہو گی اور شہید ہونے والے اس پر کس قدر مسرور اور مطمئن ہوں گے۔

محبوب کریم ﷺ فرماتے ہیں: وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ یعنی اللہ کی قسم میری یہ دلی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں (مسلم، بخاری، المسند صفحہ ۲۳۵)۔ یہ ہے اس مقدس ہستی کا فرمان جس نے اپنے ہاتھوں سے گلستان زہرا کی آب یاری کی اور اہل بیت کی تربیت پر زور نبوت صرف کیا۔ خاندان نبوت کو شہادت کے ان فضائل کا دوسروں سے زیادہ علم تھا۔ پھر انہوں نے اپنی شہادت یا اپنے پیاروں کی شہادت پر کیوں نہ فخر کیا ہو گا اور انہوں نے کیوں کر ماتم کیا ہو گا اور کیوں کر ہر سال رونے کی تعلیم دی ہو گی؟

اہل سنت کا طریقہ:

اہل سنت و جماعت کے نزدیک جس طرح تمام صحابہ، اہل بیت اور دیگر اولیاء کرام کی سیرت

اور احوال کے لیے جلسے منعقد کرنا اور عرس منانا جائز بلکہ مستحب اور ثواب کا کام ہے اسی طرح سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور شہداء کربلا کی یاد میں محافل کا انعقاد بھی نہایت پسندیدہ ہے۔

تذکرۃ الصالحین کفارۃ للسیئات اللہ کے پیاروں کی یاد گناہوں کا کفارہ ہے۔ اس دوران اگر کسی کو اتفاقیہ رونا آ جائے تو ایسے رونے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن تکلف کے ساتھ جان بوجھ کر رونے رلانے کی کوشش کرنا اور زبردستی رلانے والے قصے گھڑ گھڑ کر بیان کرنا اور اس رونے کو کارِ ثواب سمجھتے ہوئے رونے دھونے کی مجالس یا مجالس عزا قائم کرنا اور پھر ہر سال کے بعد رونے بیٹھ جانا اسلام میں بے صبری اور خدا سے دوری کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ ایسی حرکتوں سے جہاد سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے۔ یاد رکھیے اس طرح رونے سے اگر کسی کی بخشش ہو جاتی ہو تو ان رونے والوں میں یزید بھی شامل تھا۔ اگر یزید آنسو بہانے اور اپنے منہ پر طمانچے مارنے کے باوجود بدبخت ہے تو یقین رکھیے کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابہ واہل بیت علیہم الرضوان کی غلامی کے بغیر غم حسین کا ڈھونگ کچھ کام نہ دے گا۔ اسلام ایک سنجیدہ دین ہے اور ایسی چھچھوری اور غیر ذمہ دارانہ تعلیمات سے پاک ہے۔

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

آج کل واقعہ شہادت بیان کرتے وقت اکثر بے سروپا اور جھوٹی روایات کو بیان کیا جاتا ہے۔ ایسی مجالس میں جانا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے۔ اور اگر واقعہ شہادت بیان کرنے کا مقصد غم پروری اور زبردستی کا رونا دھونا ہو تو یہ نیت بھی شرعاً بُری ہے۔ غم اگر ہو بھی تو اسے دل سے دور کرنے کا حکم ہے۔ نہ یہ کہ غم سرے سے ہو ہی نہیں اور محرم کے دنوں میں اپنے اوپر زبردستی غم لا کر کے تکلف سے کام لے کر رونے کی کوشش کی جائے یا رونے دھونے کو عبادت سمجھا جائے۔ یہ سب روافض کی بدترین بدعات ہیں۔ اہل سنت پر لازم ہے کہ ان چیزوں سے بچ کے رہیں۔ اللہ کی قسم اگر اس رونے دھونے میں کوئی خوبی ہوتی تو حضور پُرنور سید عالم ﷺ کی وفات شریف پر غم کرنا اور رونا ہم پر سب سے زیادہ لازم ہوتا۔ دیکھو! سرکارِ دو عالم ﷺ کی ولادت اور وفات ایک ہی مہینے میں ہوئی لیکن علماء کرام نے ولادت شریفہ پر

خوشی منانا پسند فرمایا ہے اور وفات شریف پر غم منانا جائز نہیں سمجھا (رسالہ تعزیہ داری صفحہ ۵ از فاضل بریلوی رحمت اللہ علیہ بالتسہیل)۔

خطیبوں سے گذارش:

ہمارے بعض خطیب حضرات نے بھی رونے رلانے کا دھندا شروع کر رکھا ہے اور اپنی تقریر میں رنگ بھرنے کے لیے شیعہ کی روایات کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کی طرف بے شمار من گھڑت باتوں اور قصے کہانیوں کو منسوب کر کے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ بے شمار اقوال گھڑ کے مولا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیے گئے۔ چنانچہ امام محمد بن سیرین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ان اکثر مایروی عن علی الکذب یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی جانے والی اکثر باتیں جھوٹی ہوتی ہیں (بخاری جلد ا صفحہ ۵۲۶)۔ اسی طرح تقیہ کی آڑ میں تمام آئمہ اہل بیت کی طرف جھوٹ منسوب کیے گئے ہیں۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ ہمارے بارے میں جھوٹی باتیں گھڑنے پر عاشق ہو چکے ہیں۔ انہوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنا ان پر فرض کر رکھا ہے اور اللہ نے ان کو یہی دھندا سونپا ہوا ہے۔ میں ان میں سے کسی شخص کو اندر بیٹھ کر ایک حدیث بتاتا ہوں تو وہ باہر جا کر اسکو دوسرے معانی میں ڈھال لیتا ہے (شیعہ کی کتاب رجال کشی صفحہ ۱۳۴)۔

جھوٹ کے اسی سلسلے کی کڑی کربلا کے حالات و واقعات ہیں جنہیں لوگ اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ خود موقع پر موجود تھے۔ حالانکہ کربلا سے بچ کر آنے والے سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی شخص کربلا کے صحیح حالات بیان نہیں کر سکتا۔ اہل بیت کی خواتین پردہ میں تھیں۔ امام زین العابدین کی طبیعت مبارک ناساز تھی۔ باقی سب حضرات شہید ہو گئے۔ اب اس واقعہ کو کسی حد تک یا تو امام زین العابدین رضی اللہ عنہ بیان فرما سکتے ہیں یا پھر امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل اور دشمن بیان کر سکتے ہیں۔

عصر حاضر کے بعض اہل سنت مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں ہر کچی پکی روایت کو لکھ ڈالا ہے۔ ان حضرات سے درخواست ہے کہ تحقیق سے کام لیجیے۔ اس موضوع پر نہایت معتبر اور مستند اقوال پر

اعتماد فرمایئے اور ماتمی انداز سے گریز کیجیے۔ خصوصاً خاک کربلا اور اوراقِ غم جیسی کتابوں سے محققین کو دور رہنا چاہیے۔ بعض خطیب کہتے پھرتے ہیں کہ اٹھاون سال کی عمر میں حضرت امام حسین ﷺ کے جسم مبارک پر ایک بال بھی سفید نہیں تھا۔ مگر جیسے ہی سیدنا علی اصغر ﷺ کی گردن سے تیر کھینچا تو سارے کے سارے بال سفید ہو گئے۔ خطیبوں کی یہ ماتمی تحقیق دین سے بالکل دور اور بیگانہ ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت امام حسین ﷺ کا سر مبارک جب کاٹ کر ابن زیاد کے پاس لایا گیا تو آپ کے بالوں پر سیاہ خضاب لگا ہوا تھا و کان مخضوبا بالوسمة (بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۳۰)۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے بال مبارک پہلے ہی سفید تھے۔

بعض کہتے پھرتے ہیں کہ مرج البحرین۔ سے مراد مولا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما ہیں اور اللؤلؤ والمرجان سے مراد حسنین کریمین علیہما الرضوان ہیں۔ حالانکہ مرج البحرین سے آگے بینهما برزخ لایبغیان کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر شیعوں نے گھڑی ہے (مقدمہ تفسیر ابن تیمیہ صفحہ ۲۹)۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جاہلانہ تاویل ہے جو شیعہ نے کی ہے (الاتقان جلد ۲ صفحہ ۱۸۰)۔ ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ مرج البحرین اور اللؤلؤ والمرجان کی یہ تاویل شیعہ جیسے جاہل اور احمق لوگوں کا کام ہے فانه من تاویل الجهلة والحمقاء کالروافض (مرقاۃ جلد ۱ صفحہ ۲۹۲)۔

عوام اہل سنت سے درخواست ہے کہ دسویں محرم کے دن شہداء کربلا کے لیے قرآن خوانی کیجیے۔ درود شریف، استغفار اور کلمہ طیبہ پڑھ پڑھ کر ایصال ثواب کیجیے۔ شہداء کی طرف سے کھانے پینے کی چیزیں خیرات کیجیے۔ امام پاک ﷺ کا ذکرِ خیر سننے کے لیے اہل سنت کی محافل میں جایا کیجیے۔ اس مقصد کے لیے شیعوں کی مجالس عزا میں جانا ایمان کی تباہی ہے۔ حسین ہمارے ہیں اور ہم حسین کے ہیں۔ کسی دوسرے کو محبت حسین کا ٹھیکیدار مت سمجھیے۔

علیٰ جدہ و ابیہ و اخیہ و علیہ الصلوٰۃ والسلام

واقعہ کربلا سے ملنے والے اسباق:

1۔ سیدنا امام حسین ﷺ نے خلفاء راشدین علیہم الرضوان کی مخالفت نہ کی اور یزید کی مخالفت کی۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اہل حق کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اور اہل باطل کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

2۔ سیدنا امام حسین ﷺ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مشورہ لیا اور راستے میں اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ لیا۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ اہم کام سرانجام دینے کے لیے مشورہ کر لینا چاہیے۔

3۔ سیدنا امام حسین ﷺ نے یزید کا مقابلہ کیا اور باقی صحابہ ﷺ نے رخصت پر عمل فرمایا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جتنا کسی کا رتبہ بڑا ہوتا ہی اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

4۔ سیدنا امام حسین ﷺ کا حرمین شریفین میں جنگ کرنے کی بجائے کوفہ چلے جانا ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ حرمین شریفین کی بے ادبی سخت منع ہے۔

5۔ آپ ﷺ نے مختلف تجویزیں پیش فرما کر جنگ کو ٹالنے کی کوشش فرمائی۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ سے گریز کرنا چاہیے اور پہل ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

6۔ سیدنا امام حسین ﷺ نے میدان کربلا میں نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا۔ اپنے پیاروں کو شہید ہوتا دیکھ کر بھی ماتم اور نوحہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اہل بیت کی خواتین علیہم الرضوان نے بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اللہ کریم کی طرف سے آنے والے امتحانوں پر صبر کرنا چاہیے اور کسی قسم کا واویلا یا ماتم نہیں کرنا چاہیے۔ جو کامل ہوتے ہیں وہ رضا پر راضی رہتے ہیں۔

7۔ سیدنا امام حسین ﷺ اور ان کے ساتھی رات کو ذکر وعبادت میں مصروف رہے اور عین میدان جنگ میں بھی نماز کو یاد رکھا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مشکل وقت میں اللہ کریم جل مجدہٗ کو کثرت سے یاد کرنا چاہیے اور ہر حال میں نماز کی پابندی کرنی چاہیے۔

اللھم صل علی سیدنا ومولٰنا محمد وعلی آلہ وعترتہ

وصحبہ وازواجہ واحبائہ وسلم

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

کچھ علم حدیث کے بارے میں

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی☆

حضور اکرم نور مجسم شفیع المذنبین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ ہی زمین پر تنہا وہ ہستی ہیں جن کی طرف تا قیامت ہدایت کیلیے رجوع کیا جاتا رہے گا۔ حضور ﷺ کے توسط سے ہمیں اللہ تعالیٰ عزوجل کی آخری کتاب ملی۔ اور آپ ہی کے اسوہ حسنہ سے یہ متعین ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں سے کیسا طرزِ عمل مطلوب ہے۔ یہ اسوہ حسنہ اصطلاحی مفہوم میں سنت کہلاتا ہے۔ جو قرآن مجید کے ساتھ دین کا دوسرا ماخذ ہے۔ حضور ﷺ کی اس مرکزی حیثیت کا تقاضا ہے کہ آپ کو ہدایت کا سرچشمہ مان کر جملہ اُمور میں آپکی سنت سے رجوع کیا جائے۔ آپ ﷺ سے اسی تعلق کی بناء پر حدیث کا وہ عظیم الشان علم وجود میں آیا جو مسلمانوں کا طرہ امتیاز ہے۔

مسلمان اہل علم اس بات سے کبھی غافل نہیں رہے کہ کسی قول یا فعل کی حضور ﷺ کی طرف نسبت میں کیا نزاکتیں ہیں۔ اسلیے انھوں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ اس انتساب کو ممکنہ حد تک ہر شک وشبہ سے بالاتر بنا دیا جائے۔ ان کی انھیں کوششوں کا حاصل حدیث کے وہ علوم ہیں جن میں ایک طرف درایت کے پیمانے متعین کیے گئے تو دوسری طرف اسماء ارجال کا علم وجود میں آیا جس کے تحت ان تمام لوگوں کے احوال مرتب کیے گئے جو کسی طرح بھی روایت حدیث سے متعلق تھے۔ علم ، دیانت ، حسب ونسب ہر زاویے سے ان خواتین وحضرات کے درجات کا تعین کیا گیا۔ جن کی بنیاد پر روایت کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں حکم لگایا جاسکتا ہے۔ روایت کو پرکھنے کا یہ عمل مسلمان محدثین کی غیر معمولی کاوشوں کے نتیجے میں ایک نہایت اعلیٰ وارفع علمی مقام تک پہنچا۔ آج ہر علم کی طرح اس کی اپنی اصطلاحیں ہیں اور اپنی زبان۔

☆) 0344-7519992

کوئی علم جب اس سطح پر پہنچ جاتا ہے تو فہم عام کے لیے وہ شرح و وضاحت کا محتاج ہوتا ہے۔یوں لغات اور تشریح لٹریچر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ہمارے دین کی بنیاد قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ پر ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے دونوں بنیادوں کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔قرآن کریم کے بارے میں تو ارشاد باری تعالیٰ کی وضاحت موجود ہے!

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔(سورۃ الحجر آیت نمبر ۹) ترجمہ: ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔اسی طرح نطق رسول کو بھی وحی قرار دیا گیا۔قرآن کریم میں ہے!

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔(سورۃ النجم آیت ۳،۴) ترجمہ: اور نہ وہ اپنی خواہش سے بات کہتے ہیں وہ تو وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔

امام احمد بن حسین علی بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں!"سنت اللہ تعالیٰ کے فرمان کے قائم مقام ہے"۔(مفتاح الجنۃ ص ۴۷) جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے!

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۔(سورۃ النحل ۴۴)

ترجمہ: یہ ذکر ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں۔اس طرح سنت بھی قرآن کے ساتھ ساتھ محفوظ ہے کیونکہ سنت بھی اس ذکر میں سے ماخوذ ذکر ہے۔سنت کی حفاظت کا سب سے اہم ہتھیار سند ہے۔سند کے بغیر حدیث کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے!"الاسناد عندی من الدین ولو لا الاسناد لقال من شاء ماشاء"۔(مقدمہ صحیح مسلم شریف ص ۱۱) ترجمہ: میرے نزدیک سند دین کا حصہ ہے اور اگر سند نہ ہوتی تو جو چاہتا کہہ ڈالتا۔

امام عبداللہ الحاکم النیشاپوری مذکورہ بالا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں!"اگر اسناد نہ ہوتیں اور محدثین کرام ان کو طلب نہ کرتے اور کثرت سے یاد نہ رکھتے تو اسلام کی علامتیں مٹ جاتیں۔جھوٹی احادیث گھڑ لی جاتیں، اسناد حدیث کو الٹ پلٹ کر دیا جاتا۔اور اس طرح اہل بدعت غالب آجاتے۔کیونکہ اگر احادیث کو اسناد سے بے نیاز کر دیا جائے تو وہ بالکل بے بنیاد رہ جائیں گی"۔(معرفۃ علوم الحدیث ص ۶)

رسول اللہ ﷺ کے فرامین وافعال کو اگر پوری صحت اور دقت نظر سے منتقل کرنا ہو تو لازم ہے کہ صحیح سند کو ملحوظ رکھا جائے اور صحت سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایت ثقہ اور عادل راویوں سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچے۔ اس لیے راقم اس مضمون کے اندر علم حدیث کے بارے میں بنیادی باتوں کو قارئین (خاص وعام) کو روشناس کرانے کی کوشش کرے گا۔

حدیث کے دو حصے ہوتے ہیں:

۱)سند حدیث یا روایت حدیث (۲)متن حدیث

۱)**سند حدیث**:۔ حدیث بیان کرنے والے راویان اس حصہ کو سند حدیث کہتے ہیں۔

۲)**متن حدیث** :۔ جہاں پر راویان حدیث کا اختتام ہوتا ہے اور "قال قال رسول اللہ ﷺ" کا آغاز ہوتا ہے یہ حصہ متن حدیث کہلاتا ہے۔ کبھی ایک راوی حدیث بیان کرتا ہے تو یہ خبر واحد یا احاد کہلاتی ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں متواتر سے مراد وہ حدیث ہے جسے اتنی کثیر تعداد نے روایت کیا ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو یعنی متواتر میں تعداد کی کثرت اور ان کا عادۃً جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔

<u>طرق روایت کے لحاظ سے تقسیم حدیث</u>
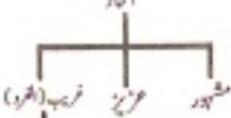
- حدیث
  - متواتر
    - لفظی
    - معنوی
  - آحاد
    - مشہور
    - عزیز
    - غریب (فرد)
      - افراد مطلق
      - افراد نسبی
        - مخصوص راوی کے حوالے سے
        - مخصوص شہر کے حوالے سے
        - ثقہ راوی کے حوالے سے

(جاری ہے)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆
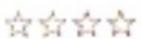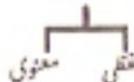
کیا یزید جنتی ہے؟

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

کچھ عرصہ سے بعض لوگوں نے یزید بن معاویہ کو جنتی ثابت کرنے کا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے اور اس کے لیے بخاری شریف کی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یوں یزید کو امیر المومنین اور رحمۃ اللہ علیہ کہنے کی دلیل بنائی جاتی ہے۔ لہذا قارئین کرام کے سامنے اس حدیث سے متعلق گزارشات پیش خدمت ہیں۔

سب سے پہلے بخاری شریف کی حدیث ملاحظہ فرمایئے:

قال النبی ﷺ اول جیش من اُمتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم ۔ترجمہ: حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا! میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر روم کے شہر پر حملہ کرے گا اس کی مغفرت فرمادی گئی ہے۔ ا

بخاری شریف کی درج ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے!''قال محمود بن الربیع فحدثتھا قوما فیھم ابو ایوب الانصاری صاحب رسول اللہ ﷺ فی غزوتہ التی توفی فیھا و یزید بن معاویۃ علیھم بارض الروم ۔۲ ترجمہ: حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک قوم کو حدیث بیان کی جس میں حضور ﷺ کے صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ارض روم کے غزوات میں انتقال فرما گئے تھے اور یزید بن معاویہ اس غزوہ کا امیر تھا۔

جواباً گذارش ہے کہ ان روایات سے یزید کے جنتی ہونے کا استدلال کرنا کئی وجوہ سے باطل ہے:

۱) مغفرت کی بشارت والی حدیث میں قسطنطنیہ کے الفاظ کسی کتاب میں نہیں۔

۲) بشارت والی حدیث میں ہے کہ جو پہلا لشکر قیصر روم کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لھم ہوگا۔

۳) یزید بن معاویہ اس لشکر میں شامل تھا جس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ شامل تھے اور وہیں انکی وفات ہوئی۔

۴) یہ لشکر آخری غزوہ کا تھا جو ۵۲ ہجری کو ہوا۔

۵) محدثین نے اس کی شرح کرتے ہوئے کیا یزید کو مغفور لھم میں شامل کیا؟

قیصر روم پر پہلا غزوہ اور بشارت مغفور لھم:

۱) حافظ ابن کثیر دمشقی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں! ''۳۲ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلاد روم پر چڑھائی کی۔ یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گئے۔ ۳ے

حافظ ابن کثیر دوسرے مقام پر لکھتے ہیں! ''خلیج قسطنطنیہ کی جنگ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں ۳۲ ہجری میں ہوئی اور وہ خود اس سال لوگوں پر امیر تھے''۔

اسی طرح درج ذیل کتابوں میں بھی ہے کہ وہ غزوہ ۳۲ ہجری میں ہوا۔

۱) المنتظم از ابن جوزی ۱۹/۵ ۲) تاریخ طبری ۳۰۴/۴ ۳) العبر از امام ذہبی ۲۴/۱

۴) تاریخ اسلام امام ذہبی یزید کی اس وقت عمر تقریبا چھ سال تھی۔ ۴ے

امام ذہبی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''فیھا کانت وقعة المضیق بالقرب من قسطنطنیة و أمیرھا معاویة ''۔ اس سن میں مضیق کا واقعہ ہوا جو کہ قسطنطنیہ کے قریب ہے اور اس کے امیر ''معاویہ'' رضی اللہ عنہ تھے۔ ۵ے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حملہ دور عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں کیا۔

۲) اس حدیث میں مدینة قیصر سے مراد ''حمص'' ہے نہ کہ قسطنطنیہ لہذا بشارت مغفرت کے امین حمص پر حملہ کرنے والے مجاہدین ہیں۔ نہ کہ مجاہدین قسطنطنیہ۔ اور حمص پر حملہ ۱۵ ہجری میں ہوا۔ جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت تھا۔

حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''پندرہ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک لشکر حمص روانہ کیا اور بعد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سخت سردیوں کے موسم میں مسلمانوں نے حمص کا محاصرہ کیا۔ سردیوں کے

اختتام تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص فتح کر لیا۔ حضرت بلال حبشی حضرت مقداد رضی اللہ عنہم اور دیگر امراء کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس فتح کی خوشخبری اور خمس روانہ کیا۔ ۷

شیخ الاسلام محمد صدر الصدور نے بھی "مدینہ قیصر" سے مراد "حمص" لیا ہے فرماتے ہیں! "بعضے تجویز کنندہ کہ مراد بمدینہ قیصر" مدینہ باشد کہ قیصر در آنجا بود روزی کہ فرمود ایں حدیث را آنحضرت وآں حمص است کہ در آں وقت دار مملکت او بود واللہ اعلم"۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ شہر قیصر سے مراد وہی شہر ہے کہ جہاں قیصر اس روز تھا جس روز حضور ﷺ نے یہ حدیث فرمائی اور یہ شہر حمص تھا جو اس وقت قیصر کا دار السلطنت تھا۔ واللہ اعلم۔ ۷

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں! "وجوز بعضهم ان المراد بمدينة قيصر المدينة التى كان بها يوم قال النبى ﷺ تلك المقالة وهى حمص وكانت دار مملكته اذ ذاك"۔ اور بعض علماء کے نزدیک مدینہ قیصر سے مراد وہ شہر جہاں قیصر اس دن تھا۔ (یعنی جو اس کا دار السلطنت تھا) جس دن حضور ﷺ نے یہ فرمان فرمایا تھا وہ حمص ہے جو اس وقت انکا دار السلطنت تھا۔ ۸

اس وقت ۱۵ ہجری میں یزید پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ بعض مورخین محدثین نے یزید بن معاویہ کو اول جیش کا امیر لکھا ہے۔ یہ سہو ہوا ہے کیونکہ وہ امیر یزید بن فضالہ بن عبید تھے یہاں یزید بن معاویہ کا نام راوی کی غلطی ہے۔

حافظ ابن کثیر دمشقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "عمران بن اسلم کہتے ہیں کہ حضرت ابو ایوب انصاری بھی ہمارے لشکر میں شامل تھے۔ وكنا بالقسطنطنية وعلى اهل مصر عقبة بن عامر و على اهل الشام رجل يزيد ابن فضالة ابن عبيد"۔ اور ہم قسطنطنیہ میں تھے۔ اہل مصر پر عقبہ بن عامر اور اہل شام پر یزید بن فضالہ بن عبید امیر تھے۔ ۹

سنن ابوداؤد کی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو! "حدثنا احمد بن عمرو بن السرح نا ابن وهب نا حيوة بن شريح و ابن لهيعه عن يزيد بن ابى حبيب عن اسلم ابى عمران قال غزونا من

المدينة يزيد القسطنطية وعلى الجماعة عبد الرحمن بن خالد بن وليد ''۔ ابوعمران کا بیان ہے کہ ہم جہاد کرنے کیلیے مدینہ منورہ سے قسطنطیہ کی طرف روانہ ہوئے اور سپہ سالار عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید تھے۔ ۱۰

اس کے علاوہ ایک اور روایت بھی یہ اشارہ کرتی ہے کہ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید لشکر کے امیر تھے:

''حدثنا سعيد بن منصور ثنا عبد الله بن وهب قال اخبرني عمر بن الحارث عن بكير بن الاشج عن ابن الاشج عن ابن تقلى قال غزونا مع عبد الرحمن بن خالد بن الوليد فاتي باربعة اعلاج من العدود فامرهم فقتلوا صبرا قال ابو داؤد قال لنا غير سعيد عن ابن وهب في هذا الحديث قال بالنبل صبرا فبلغ ذالك ابا ايوب الانصاري قال سمعت رسول الله ﷺ ينهى عن قتل الصبر فوالذي نفسي بيده لو كانت دجاجة ماصبر تها فبلغ ذالك عبد الرحمن ابن خالد بن الوليد فاعتق اربع رقاب ''۔ بکیر بن اشج نے ابن تقلی سے روایت کی ہے کہ ہم نے عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی معیت میں جہاد کیا تو دشمن کے چار قیدی لائے گئے جن کے متعلق آپ نے حکم دیا تو انھیں باندھ کر قتل کیا گیا۔ امام ابوداؤد نے فرمایا کہ سعید کے علاوہ دوسروں نے ابن وھب کے واسطے سے یہ حدیث ہم سے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ باندھ کر تیروں کے ساتھ۔ جب یہ بات ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرماتے ہوئے سنا۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر مرغی بھی ہو تو اسے نہ باندھوں گا۔ جب یہ بات عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کو پہنچی تو انھوں نے چار غلام آزاد کیے۔ ۱۱

بشارت والی حدیث اور محدثین: بشارت والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے محدثین کرام نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے کہ یزید قطعاً اس بشارت کا مصداق نہیں ہے اور مغفرت عموم سے بالکل خارج ہے۔ مگر افسوس کہ اکثر غیر مقلدین اور دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء نے اس حدیث سے یہی باور کرایا ہے کہ یزید جنتی ہے اور اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جیسے ''رشید ابن رشید'' نامی کتاب

پر ان دونوں مکاتب فکر کے علماء کی تصدیقات ہیں۔ اسی طرح دیگر کئی کتب جو یزید کو امیر المومنین اور رحمۃ اللہ علیہ ثابت کرنے کیلئے لکھی گئی ہیں۔ ان میں محدثین کی نامکمل عبارات لکھ کر لوگوں کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ محدثین کی تصریحات ملاحظہ فرمایئے۔

''قوله قد اوجبوا فعلوا وجبت لهم به الجنة قوله مدينة قيصر اى ملك الروم قال قسطلانى كان اوّل من غزا مدينة قيصر يزيد ابن معاوية و جماعة من سادات الصحابة كابن عمر وابن عباس وابن الزبير وابى ايوب انصارى و توفى بها ابو ايوب اثنين و خمسين من الهجرة انتهى كذا قاله فى الخير البارى و فى الفتح قال المهلب فى هذا الحديث منقبة لمعاوية لانه اوّل من غزا البحر و منقبة لولده لانه من غزا مدينة قيصر و تعقبه ابن التين وابن المنير بما حاصله انه لا يلزم من دخوله فى ذالک العموم ان لا يخرج بدليل خاص اذ لا يختلف اهل العلم ان قوله ﷺ مغفور لهم مشروط بان تكونوا من اهل المغفرة حتى لو ارتد واحد ممن غزاها بعد ذالک لم يدخل فى ذالک العموم اتفاقاً فدل على ان المراد مغفور لمن وجد شرط المغفرة فيه منهم''۔ ترجمہ: ''قوله قد اوجبوا'' ان کے لیے جنت واجب ہے۔ مدینہ قیصر یعنی ملک روم قسطلانی فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے مدینہ قیصر پر یزید بن معاویہ نے جہاد کیا۔ اس کیساتھ سادات صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ مثلاً حضرت ابن عمر، ابن عباس، ابن زبیر اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہما۔ اور آپ کا انتقال بھی ۵۲ ھجری میں وہیں پر ہوا۔ خیر الباری اور فتح الباری میں ہے کہ مہلب نے کہا کہ اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے کیونکہ انھوں نے سب سے پہلے بحری لڑائی کی اور آپ کے بیٹے (یزید) کی منقبت ہے کہ اس نے قسطنطنیہ میں جنگ کی ابن تین اور ابن منیر نے مہلب کا تعاقب کیا، اور انھوں نے کہا کہ اس عموم میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی دلیل خاص سے اس بشارت سے خارج نہ ہو سکے کیونکہ اہل علم کا اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان الہیت مغفرت کے ساتھ مشروط ہے حتیٰ کہ اگر ان (مجاہدین) میں سے کوئی

مرتد ہو جائے تو وہ اس (بشارت) کے عموم سے ہرگز داخل نہیں ہوگا۔پس ثابت ہوا کہ مغفور لھم کی بشارت انھی کیلیے ہے جن میں شرط مغفرت پائی جائے گی۔۱۲ علامہ قسطلانی نے بھی یہی کچھ لکھا اور مزید فرمایا کہ (یزید) بنو امیہ کی حمیت کی وجہ سے اس غزوہ پر گیا تھا۔۱۳

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ نے بھی تقریباً یہی بات لکھی ہے۔۱۴

علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں! "وکان فی ذالک الجیش ابن عباس وابن عمر وابن زبیر وابو ایوب الانصاری قلت الا ظهرو ان هؤلاء السادات من الصحابة کانوا مع سفیان هذا فلم یکونوا مع یزید لانه لم یکن اهلاً ان یکون هولاء السادات فی خدمته قال المهلب فی هذا الحدیث منقبة لمعاویة کان اوّل من غزا البحر ومنقبة لولده یزید لانه اوّل من غزا مدینة قیصر قلت ای منقبة لیزید وحاله مشهور فان قلت قال ﷺ فی حق هذا الجیش مغفور لهم قلت قیل لا یلزم من دخوله فی ذالک العموم ان لا یخرج بدلیل خاص اذلا یختلف اهل العلم ان قوله ﷺ مغفور لهم مشروط بان یکونوا من اهل المغفرة حتیٰ لو ارتد واحد ممن غزاها بعد ذالک لم یدخل فی ذالک العموم فدل علی ان الامراد مغفور لمن وجد شرط المغفرة منهم "۔ترجمہ! اور اس لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم تھے۔ میں یہ کہتا ہوں یہ سادات صحابہ حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تھے۔ نہ کہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں کیونکہ یزید ہرگز اس قابل نہ تھا کہ سادات صحابہ اس کی سرکردگی میں ہوں۔ مہلب نے کہا اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے جنگ لڑی اور انکے بیٹے یزید کی منقبت ہے کہ اس نے مدینہ قیصر پر حملہ کیا۔ میں (علامہ عینی) کہتا ہوں اس میں یزید کی کونسی منقبت ہے جب کہ اس کا حال مشہور ہے۔ اگر تم کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کیلیے "مغفور لھم" فرمایا تو ہم کہتے ہیں کہ عموم میں داخل ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ دلیل خاص سے خارج نہ ہو سکے، کیونکہ اس میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ

ﷺ کا ارشاد مغفور لھم مشروط ہے کہ وہ آدمی مغفرت کا اہل ہو۔حتیٰ کہ اگر غازیوں میں کوئی مرتد ہو جائے تو وہ اس عموم میں داخل نہیں رہتا۔پس ثابت ہوا کہ مغفرت اسی کیلئے ہے جو مغفرت کا اہل ہوگا۔ ۱۵

یزید بن معاویہ جس لشکر میں شامل تھا وہ ۵۲ ھجری میں قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا تھا۔جبکہ پہلا حملہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا جیسا کہ پچھلے اوراق میں تفصیل ذکر کی گئی۔یزید والا لشکر ۵۲ ھجری میں حملہ آور ہوا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ اس لشکر میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۲ ھجری میں ہوا۔

۱) علامہ ابن کثیر دمشقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!''وذالک سنة ۵۲ ھ اثنین و خمسین ومعھم ابو ایوب فمات ھناک''۔اسی سال ۵۲ ھجری میں ان کے ساتھ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے اور آپکا انتقال بھی وہیں ہوا تھا۔ ۱۶

۲) علامہ ذہبی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!''وکان ابو ایوب سنة ۵۲ ھجری''۔حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۲ ھجری میں ہوا۔ ۱۷

۳) علامہ ابن اثیر نے ۵۲ ھجری کے حوادث میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸

۴) یزید کے حامی محمود احمد عباسی نے بھی طبقات ابن سعد کے حوالے سے لکھا!''وتوفی ابو ایوب انصاری عام غزا یزید ابن معاویة القسطنطنیة خلافة ابیه سنة ۵۲ھ...''۔ ۱۹

۵) علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں!''وکانت غزوۃ یزید المذکورۃ فی سنة اثنین و خمسین من الھجرۃ وفی تلک الغزوۃ مات ابو ایوب الانصاری فاوصی ان یدفن عند باب القسطنطیة''۔ترجمہ:اور یزید کا مذکور غزوہ ۵۲ ھ میں ہوا،اسی غزوہ میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا،اور انھوں نے وصیت فرمائی کہ مجھے قسطنطیہ کے دروازے کے پاس دفن کیا جائے۔

ان تمام حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ یزید کے لشکر میں شامل تھے اور وہ لشکر ۵۲ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا اور اسی حملہ میں صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور یہ قسطنطنیہ پر آخری حملہ تھا۔ جبکہ مغفرت کی بشارت والی حدیث میں صراحت ہے کہ ''پہلا لشکر جو ہوگا اس کی مغفرت ہوگی''۔ دوسری طرف دیکھئے کہ یزید اس غزوہ میں شوق یا جوش جہاد سے نہیں گیا بلکہ مجاہدین کو پہنچنے والی تکالیف پر خوشی کا اظہار کرنے کی وجہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے جبراً بھیجا تھا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں! ''۵۰ ہجری میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بہت بڑا لشکر حضرت سفیان بن عوف کی قیادت میں بلاد روم پر حملہ کیلئے بھیجا اور اپنے بیٹے یزید کو بھی اس میں شریک ہونے کو کہا لیکن اس نے بڑی گرانی محسوس کی تو آپ نے چھوڑ دیا۔ پھر لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس لشکر کے مجاہدین سخت بھوک اور بیماری کا شکار ہوئے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ یزید نے اس لشکر کا حال سن کر یہ اشعار پڑھے۔

مَا اِنْ اُبَالِیْ بِمَا لَاقَتْ جُمُوْدُ غُهُمْ . بِالْفُدْ قَدِ الْبَیْدِ مِنَ الْحُمّٰی وَمِنْ شُوْمٍ . اِذَا اتَّطَاتُ عَلَی الْاَنْمَاطِ مُرْتَفِقًا . بِدَیْرِ مُرَّانِ عِنْدِیْ اُمُّ کُلْثُوْمٍ وَهِیَ امْرَأَةُ بِنْتُ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَامِرٍ فَحَلَفَ لَیُلْحِقَنَّهُ بِهِمْ فَسَارَ فِیْ جَمْعٍ کَثِیْرٍ. ترجمہ: مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ بخار اور بدقسمتی کی وجہ سے اس کھلے صحرا میں ان لشکروں پر کیا بیتی۔ جبکہ میں نے دیر مران میں بلند ہو کر قالینوں پر تکیہ لگایا۔ اور میرے پہلو میں ام کلثوم موجود ہے۔ یہ عبداللہ بن عامر کی بیٹی (اور یزید کی بیوی تھی) تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ یزید کو اس لشکر کے ساتھ بھیجیں گے چنانچہ جماعت کثیرہ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ [20] علامہ ابن اثیر نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ [21]

اگر بالفرض یزید کو بشارت والی حدیث کا مصداق مان لیا جائے تو اس حدیث کا مفاد صرف یہ ہے کہ یزید کے اس وقت تک جتنے گناہ تھے وہ بخش دیئے گئے۔ بعد میں یزید کے افعال قبیحہ نے اسے اس بشارت سے محروم کر دیا کیونکہ جہاد ایک عمل خیر ہے جس سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن بعد والے معاف نہیں ہوتے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے

ہیں: ''حضور ﷺ کی اس حدیث پاک ''مغفور لھم'' سے بعض لوگوں نے یزید کی نجات پر استدلال کیا ہے کیونکہ وہ اس دوسرے لشکر میں شریک تھا، بلکہ اس کا افسر و سربراہ تھا۔ جیسا کہ تاریخ گواہی دیتی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس غزوہ سے پہلے جو اس نے گناہ کیے وہ بخش دیئے گئے، کیونکہ جہاد کفارات میں سے ہے اور کفارات کی شان یہ ہے کہ وہ سابقہ گناہوں کے اثر کو زائل کرتا ہے بعد میں ہونے والے گناہوں کے اثر کو نہیں۔ ہاں اگر اسی کے ساتھ یہ فرما دیا ہوتا کہ قیامت تک کے لیے اس کی بخشش کر دی گئی ہے تو بے شک یہ حدیث اس کی نجات پر دلالت کرتی۔ اور جب یہ صورت نہیں تو نجات بھی ثابت نہیں، بلکہ اس صورت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور اس غزوہ کے بعد جن جن برائیوں کا وہ مرتکب ہوا ہے جیسے امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کروانا، مدینہ طیبہ کو تاخت و تاراج کرانا، شراب نوشی پر اصرار کرنا، ان سب گناہوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے چاہے تو معاف کرے چاہے تو عذاب دے جیسا کہ تمام گناہ گاروں کے حق میں یہی طریقہ رائج ہے''۔ ۲۲ یہی مفہوم علامہ قسطلانی نے ''ارشاد الساری ۵/۱۲۵'' اور علامہ بدر الدین عینی نے ''عمدۃ القاری ۱۴/۱۰'' میں فرمائی ہے۔

غیر مقلدین کے حافظ زبیر علی زئی نے ماہنامہ ''الحدیث'' شمارہ ۹ صفحہ ۱۴ اور عبداللہ دامانوی نے ماہنامہ ''محدث'' جنوری ۲۰۱۰ء صفحہ ۴۸ میں اور مولانا ارشاد الحق نے بھی ماہنامہ ''محدث'' اگست ۱۹۹۹ء میں یہی موقف اپنایا ہے کہ یزید اس حدیث کا مصداق نہیں، اور نہ اس حدیث سے اس کی نجات ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور الرحیم ہے۔ وہ مالک یوم الدین ہے۔ وہ اگر یزید کو بخشنا چاہے تو اُس کی مرضی، لیکن قواعد شرعیہ کی رو سے عترت پیغمبر کے قاتل، مدینۃ الرسول کو تاخت و تاراج کرنے والے اور حرم کعبہ پر سنگ باری کے مجرم یزید کو جنتی کہنا بہت بڑی جہالت، بخت لا دینیت ہے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

حوالہ جات

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد، ما قیل فی قتال الروم رقم الحدیث ۲۹۲۴، صحیح بخاری مترجم ۲/۱۰۷، باب نمبر ۱۳۷

کتاب الجہاد والسیر رقم الحدیث ۲۸۱۲ طبع لاہور ترجمہ عبدالحکیم خان اختر شاہجہانپوری، صحیح بخاری مترجم وحید الزمان ۲/ ۱۱۸ باب نمبر ۱۳۷ کتاب الجہاد والسیر پارہ نمبر ۱۱ رقم ۱۸۵ طبع لاہور، البدایہ والنھایہ صفحہ ۹۲۹ باب نمبر ۲۷ ما قیل فی قتال الروم مکتبہ بیت الافکار، المستدرک حاکم ۴/ ۵۹۹ رقم الحدیث ۸۲۶۸، سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ۱/ ۷۶ رقم ۲۶۸، حلیۃ الاولیاء: ابونعیم اصفہانی، مسند الشامیین طبرانی۔

۲) صحیح بخاری ۱/ ۱۵۸ کتاب التہجد باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ (۳) البدایہ والنھایہ ۷/ ۱۵۹

۴) دیکھئے: تقریب التھذیب ۲/ ۳۳۲ (۵) تاریخ اسلام: امام ذہبی، عہد خلفائے راشدین ص ۳۷۱

(۶) البدایہ والنھایہ ۷/ ۵۲ (۷) شرح قاری صحیح بخاری برحاشیہ تیسیر القاری ۴/ ۲۶۹

(۸) فتح الباری ۱۲/ ۲۱ (۹) تفسیر ابن کثیر ۱/ ۲۱۷

۱۰) سنن ابوداود مع احکام البانی ص ۳۳۱ باب فی قولہ عزوجل ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ: کتاب الجہاد رقم ۲۵۱۲ (صحیح)، سنن ابوداود مترجم ۲/ ۲۸۱ طبع لاہور، مستدرک حاکم ۲/ ۱۰۳ رقم ۲۳۸۹ طبع قاہرہ، جامع البیان فی تفسیر القرآن ۲/ ۱۱۸، ۱۱۹، ۱، احکام القرآن از جصاص ۱/ ۳۲۶، تفسیر ابن ابی حاتم رازی ۱/ ۳۳۰، ۳۳۱ (۱۱) سنن ابوداود مترجم ۲/ ۳۲۳، مصنف ابن ابی شیبہ ۵/ ۳۹۸، مسند احمد ۵/ ۴۲۳ برقم ۲۳۹۸۷، صحیح ابن حبان ۸/ ۲۵۰، طبرانی ۴/ ۳۹ رقم ۴۰۰۲، الطحاوی ۳/ ۱۸۲، ۱، السنن الکبریٰ بیہقی ۹/ ۷۱، سنن داری ۲/ ۱۱۳ رقم ۲۴۷۳، ۱۹، سنن سعید بن منصور صفحہ ۲۶۷

۱۲) بخاری شریف کی حدیث کا حاشیہ جلد اول صفحہ ۴۰ (۱۳) دیکھیے: ارشاد الساری شرح بخاری ۵/ ۱۲۵

۱۴) فتح الباری شرح بخاری ۱۲/ ۹۱ (۱۵) عمدۃ القاری شرح بخاری ۱۲/ ۱۰ مطبوعہ مصر

۱۶) البدایہ والنہایہ ۸/ ۵۹ (۱۷) تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۲۹

۱۸) ابن اثیر ۳/ ۲۹۳ (۱۹) خلافت معاویہ و یزید صفحہ ۹۷ (۲۰) تاریخ ابن خلدون ۳/ ۱۹، ۲۰ (۲۱) ابن اثیر ۳/ ۲۵۸ (۲۲) شرح تراجم ابواب البخاری صفحہ ۳۱، ۳۲

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆
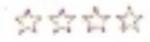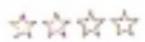
اسلام بمقابلہ عیسائیت

علامہ سعید محمد عامر آسوی حسینی نقشبندی ☆

عیسائیت:

مدعیان مسیحیت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال وافعال اور سیرت طیبہ کے احوال "عیسائیت" کی اساس ہیں۔ چنانچہ "دی امریکن چیپٹرز انسائیکلو پیڈیا (جلد ۵، ۱۹۶۰ء) کا گو میں درج ہے کہ!

Christianity:The religion founded by Jesus of Nazareth in the first century AD and centring in life ,mission and message.

"عیسائیت وہ مذہب ہے جس کی بنیاد پہلی صدی میں مسیح ناصری نے رکھی، اور جس کا محور ان کی زندگی، مقصد حیات اور پیغام ہے۔"

لیکن ان مدعیان مسیحیت کے پاس حضرت مسیح علیہ السلام کی کوئی ایسی سیرت موجود نہیں جو عیسائیت کے معنی کے صحیح ہونے کے لئے کافی ہو۔ اسی لیے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ "یسوع مسیح" (Jesus christ) میں لکھا ہے:

Any attempt to write a "Life of Jesus" should be frankly abandoned. The material for it certainly does not exist .It has been calculated that the total number of days in his life regarding which we have any record does not exceed 50 .

0306-8420977 ☆

''درست بات یہ کہ حیات مسیح پر لکھنے کی کوشش ترک کردی جائے۔ یقیناً اس کیلئے مواد موجود نہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے پاس ان کی حیات (مقدسہ) کے پچاس (۵۰) دنوں سے زیادہ کے متعلق ریکارڈ موجود نہیں''

ماضی قریب میں مشہور مبلغ ڈین انجی (Dean Inge) نے بھی اعتراف کیا ہے کہ

"No real biography of Jesus can ever be written"

''مسیح کی کوئی حقیقی سوانح عمری کبھی نہیں لکھی جا سکتی''

(Christian Ethics and Modern Problems, London - 1930)

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ جدید عیسائیت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت مقدسہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بھلا جس قوم کے پاس اپنے مذہبی پیشوا کی زندگی کے ۵۰ دنوں سے زیادہ کا ریکارڈ ہی موجود نہیں اور جو انکی حقیقی تعلیمات کو محفوظ ہی نہیں رکھ سکی وہ ان کی غلامی اور ان کے نقوش پر چلنے کا دعویٰ کیونکر کر سکتی ہے۔

اسلام:

اسلام کے معنی ہیں ''زمین پر سر رکھنا'' اور ولادت کے قانون عام کے مطابق انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ سر کے بل پیدا ہوتا ہے۔ گویا زبان حال سے اعلان کرتا ہے کہ میں اسلام پر پیدا ہوا ہوں۔ اسی لئے حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''کل مولود یولد علی الفطرۃ'' یعنی ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ لہذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام انسان کا پیدائشی دین ہے۔ پھر اسلام کے ہر حکم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا آسان ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں دین اسلام کے احکامات قرآن حکیم کی شکل میں عطا فرمائے، ساتھ ہی ان کی تشریح و توضیح کے لئے اپنے پیارے نبی علیہ السلام کو بھی مبعوث فرمایا۔ اور حضور ﷺ نے اسلام کے ہر حکم کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر کچھ ایسے حسین انداز میں پیش فرمایا کہ پھر کوئی ابہام، ابہام اور کوئی اشکال، اشکال نہ رہا۔ لہذا یہ

کہنا عین حقیقت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے افعال و فرمودات کا نام اسلام ہے۔ اور ہر مسلمان دین اسلام کے احکامات کی بہترین سمجھ بوجھ کے لیے سیرت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔

عیسائیت کے برعکس جہاں جناب عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات سے آشنائی ناممکن ہے، بانی اسلام ﷺ کی سیرت اقدس کا ہر ورق اجلا، ہر نقش زریں اور ہر پہلو روشن نظر آتا ہے۔ اور حضور ﷺ کے ماننے والوں نے آپ ﷺ کی ایک ایک ادا کو کچھ اس حسن اہتمام سے اپنے حافظوں اور کتابوں میں محفوظ کیا ہے کہ بڑے بڑے مغربی مفکر اور مستشرقین ورطۂ حیرت کا شکار ہیں کہ کیا کسی ہستی کی زندگی کے مختلف اور باریک گوشوں کو اتنی خوبصورتی سے آئندہ نسلوں کی تعمیر سیرت کے لیے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

آج ہمارے پاس احادیث کا وسیع و مستند ذخیرہ ہے جس کی روشنی میں ہم حضور علیہ السلام کی تعلیمات و احکامات اور سیرت و کردار پر کھل کر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اور ان احادیث کی صحت اور جانچ پرکھ کے لئے اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن معرض وجود میں آیا ہے جسکی نظیر دنیا میں کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر اسپرنگر رقمطراز ہیں کہ!

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری ہے نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو"۔

اس علم کی بدولت آج احادیث کا قابل قدر اور با اعتماد ذخیرہ حضور علیہ السلام کی سیرت وتعلیمات کے سلسلے میں موجود ہے۔

اسلام اور عیسائیت میں ایک بڑا فرق:۔

اسلام اور عیسائیت میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ عیسائیت میں بنی نوع انسان کیلئے نہ کوئی علمی نظریہ ہے نہ عملی پروگرام۔ حیات انسانی کے کسی شعبے کے لئے بھی اس نے کوئی ضابطہ پیش نہیں کیا ہے۔ یاد رہے کہ دور حاضر کی عیسائیت کا اصل بانی پولس ہے۔ یعنی آج جن عقائد و نظریات کی بنیادوں

پر مسیحیت قائم ہے۔ان کا جناب عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات یا ان کے حواریوں کے نظریات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ پولس کے عطا کردہ ہیں۔ چنانچہ ممتاز مؤرخین فلائڈ راس (Floyd Ross) اور مسز ہلز (Mrs.Hills) لکھتے ہیں۔

Of all the people associated with the beginnings of Christianity, paul was the most responsible for the turn its beliefs took.He added a new note that determined its future course.

''ان سب لوگوں میں جن سے عیسائیت کی ابتداء وابستہ ہے۔ پولس اس تبدیلی کیلئے سب سے زیادہ ذمہ دار تھا جو اس کے عقائد میں آئی۔ اس نے (ان عقائد میں) ایک نئی طرح ڈالی جس نے اس کے (عیسائیت کے) مستقبل کی راہیں متعین کیں۔''

(Floyd.H.Ross and Tynette Hills,p.137)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مروجہ عیسائیت کے بانی پولس نے خود یہ نظریات کہاں سے لئے؟ اس کا جواب زیورچ یونیورسٹی کے فاضل عیسائی پروفیسر آرنلڈ میئر (Arnold Meyer) کی زبانی سنئے۔

"As one asks:whence did St.paul derive his teaching? The simplest answer would seem to be :By tradition from Jesus through the instrumentality of the original apostles. But the answer given by St.paul himself is quite different :I received my Gospel not from men ,but by a revelation of Jesus Christ."

''اگر کوئی سوال کرے کہ پولس نے جو تعلیم دی اسے اس نے کہاں سے اخذ کیا؟ تو اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہونا چاہیے تھا: ان روایات سے جو اسے اصل حواریوں کے ذریعہ پہنچی تھیں۔ مگر جو

جواب خود پولس نے دیا ہے، وہ بالکل مختلف ہے۔ (وہ کہتا ہے کہ) میں نے اپنی انجیل انسانوں سے نہیں بلکہ یسوع مسیح کے مکاشفہ سے حاصل کی ہے۔"

(Arnold Meyer: "Jesus or paul")

پولس خود بھی اس حقیقت کا اعتراف یوں کرتا ہے! "اے بھائیو! میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری میں نے سنائی وہ انسانوں کی سی نہیں۔ کیونکہ وہ انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی، بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اس کا مکاشفہ ہوا"

(انجیل، گلتیوں کے نام پولس کا خط)

گویا جدید عیسائیت دراصل "پولس کے مکاشفات" پر مشتمل ہے۔ پولس کے ان مکاشفات کی صحت کیا ہے، یہ تو کوئی "اہل نظر" ہی بتا سکتا ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ دین کی بنیاد مکاشفات یا خوابوں پر نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ آسمانی کتابوں یا صحیفوں اور انبیاء و رسل کی تعلیمات و تشریحات پر رکھی جاتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مروجہ عیسائیت کی کوئی بنیاد سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ نہ تو ان کے پاس کسی آسمانی کتاب کا حرف بحرف نسخہ ہے اور نہ اپنے کسی نبی کی سیرت کی کوئی مصدقہ دستاویز۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے قرآن میں توحید و رسالت، جزا و سزا، جنت و دوزخ، حرام و حلال اوامر و نواہی حتیٰ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق مکمل ہدایات پیش کی ہیں اور ان کی بہترین تشریح و تفصیل کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ اور آپ ﷺ کے فرمودات کھلی کتاب کی مانند ہمارے سامنے موجود ہیں۔ قرآن وہ کتاب ہے کہ کرہ ارض پر بسنے والا کوئی انسان اس میں تحریف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلئے کہ قرآن اتارنے والا کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ " نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون " ترجمہ: ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے۔ پھر ہر دور میں لاکھوں مسلمانوں نے حفظ قرآن کا اہتمام کیا ہے۔ جہاں کسی نے کوئی زیر زبر شد مد غلط پڑھی، بیسیوں لوگوں نے اسے ٹوک دیا کہ یوں نہیں، یوں ہے۔ چنانچہ ایف ایف آر تھرنات اس بات کا اقرار یوں کرتا ہے:

"and that this has remained the sa me,without any change and alteration. ... ." (The construction of the Bible and Quran)

"یہ کہ قرآن بالکل اصلی حالت میں رہا ہے۔ اس میں آج تک کوئی جیالا، مترجم یا محرف کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم نہیں کر سکا۔ افسوس یہ ہے کہ عہد نامہ جدید وقدیم کی سب کتابوں (بلکہ کسی ایک کتاب) کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔"

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بائبل (Bible) کے ماننے والے خود آگاہ ہیں کہ بائبل کی جمع وتدوین کی پوری تاریخ ردّ وبدل، حذف واضافہ اور تحریف وترمیم کی تاریخ ہے۔ کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار برطانوی مصنف مسٹر لیکی، ماسٹر اس (میرٹ مسیح ۱۸۳۵ء) بروفو بائبز (۱۸۷۸ء) ڈاکٹر ابن سن، فلپ ودیبن، برمن یونیورسٹی کے پروفیسر بارنک (What is Christianity) نے کیا۔ نیویارک ٹائمز کی ایک خبر کے مطابق امریکہ میں پریسبائٹرین (presbytarian) کلیسا کی ایک نمایاں برانچ نے اعلان کیا کہ "یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بائبل غلطیوں سے پاک ہے"

"ٹائم میگزین" ۱۹۶۹ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ۹۵ فیصد عیسائی علماء اور عوام کا یقین ہے کہ بائبل تحریف شدہ ہے۔ جرمنی کے ایک رسالہ "دی اسپگل" نے بڑے بڑے پروفیسروں کے حوالے سے نیز کوپن ہیگن (ڈنمارک) کے چرچ آف رائل ڈاک یارڈ کا ڈین نے بھی کم وبیش یہی کہا۔

عیسائیت کے بنیادی نظریات:۔

عیسائیت کے دو بنیادی نظریات ہیں۔

۱۔ نظریہ تثلیث (Trinity) ۲۔ کفارہ کا نظریہ (Atonement)

۱۔ نظریہ تثلیث (Trinity):۔ عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے۔ یہ تین اقانیم کون ہیں جن کا مجموعہ ان کے نزدیک خدا ہے۔ انکی تعیین میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض باپ بیٹے اور روح القدس کو اور بعض باپ، بیٹا اور "کنواری مریم" کو تین اقانیم قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ان سے سوال کیا جائے کہ ان تین میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے؟ خدا سے

اس کا کیا رشتہ ہے؟ تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں ملتی ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان تین میں سے ہر ایک بذات خود بھی مجموعہ خدا جیسا ہے، دوسرے گروہ کے مطابق تینوں میں سے ہر ایک الگ الگ خدا تو ہیں لیکن مجموعہ خدا (Trinity) سے کمتر ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ تین خدا ہی نہیں، خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔ ان سب کا کسی ایک طرز فکر یا عقیدہ پر یکجا نہ ہونا ہی ان کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ ہمارے قرآن نے ان باطل نظریات کا رد ان الفاظ میں کیا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثہ (پ ۶۔ ع ۱۴) ترجمہ: بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں اللہ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (پ ۶ ع ۷) ترجمہ: بے شک کافر ہوئے وہ جنھوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔

عیسائیت میں خدا کا جو ایک کمزور تصور دیا گیا ہے اس کے برعکس اسلام نے حقیقی اللہ کی شان وعظمت یوں بیان فرمائی۔

انما اللہ الہ واحد ط سبحنہ ان یکون لہ ولد م (النساء۔۔ ع ۳) ترجمہ: اللہ تو ایک ہی خدا ہے۔ پاکی اسے اس سے کہ اس کے کوئی بچہ ہو۔

قل ھو اللہ احد o اللہ الصمد o لم یلد ولم یولد o ولم یکن لہ کفوا احد o ترجمہ: تم فرماؤ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی۔ یہ ہے خدا کا وہ حقیقی اور جاندار تصور جو قرآن نے دیا ہے جبکہ پوری عیسائیت اور اس کی ذریت اس سے خالی ہے۔

۲۔ نظریہ کفارہ (Atonement):۔ مسٹر ڈینیل ولسن کے مطابق یہ نظریہ عیسائی مذہب کی جان ہے اور فی نفسہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انسائیکلو پیڈیا برینا نیکا (vol.5) میں درج ہے:

"The doctrine of salvation has taken the most prominent place in th echristian faith : so

prominent,indeed ,that to a large portionof believers it has been the supreme doctrine,and the doctrine of the deity of Jesus has been valued only because of its necessity on the effect of atonement".

''نجات کے نظریہ کو عیسائی عقیدہ میں نمایاں ترین جگہ حاصل ہے، اتنی نمایاں کہ اکثر عیسائی ایمانداروں کے نزدیک یہ عیسائیت کا اعلیٰ ترین نظریہ ہے۔ حتیٰ کہ یسوع کے خدا ہونے کے نظریہ کی اہمیت بھی اس لیے ہے کہ کفارہ کو موثر بنانے کے لئے اس کا ماننا ضروری ہے۔''

اس عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پھانسی کے ذریعے مزعومہ موت اور پھر جی اٹھنے سے انسان کی نجات کی صورت پیدا ہوئی اور اس کا ازلی گناہ، **(Original Sin)** معاف ہوا۔ یہ ازلی گناہ کیا تھا؟ جس کی پاداش میں ساری نسل انسانی مجرم بنی ہوئی تھی۔ اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ عیسائی جناب آدم وحوا علیہم السلام اور ان کی نسل کے ہر فرد کو گنہگار مانتے ہیں یہاں تک کہ نبیوں اور رسولوں سے متعلق بھی ان کا اعتقاد یہی ہے کہ یہ گناہوں سے پاک نہ تھے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ سب سے پہلا گناہ (جناب) حوا علیہا السلام نے کیا پھر (جناب) آدم علیہ السلام کو اس درخت سے کھانے کی طرف راغب کیا جس کے قریب جانے سے خدا نے روکا تھا۔ تو آدم وحوا علیہم السلام کے اس گناہ سے تمام نسل انسانی گنہگار ہوگئی۔ جس کی وجہ سے مستحق سزا ٹھہری۔ اب ان کی نجات کے لیے ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو خود گنہگار نہ ہو۔ اور جناب عیسیٰ علیہ السلام وہ ہستی تھے۔ کیونکہ یہ ابن اللہ ہیں۔ باقی آدم وحوا (علیہم السلام) کے بیٹے ہیں۔ اب خدا نے ان سے کہا: ''اے پیارے بیٹے مسیح! میں تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ تیرے سر پر رکھ کر صرف تجھی کو سزا دوں گا۔ تو صلیب پر چڑھ جا اور تین دن تک (معاذ اللہ) لعنت کی موت مردہ رہ کر گنہگاروں کے گناہوں کا کفارہ کر دے تاکہ بنی نوع انسان کی نجات ہو جائے۔'' چنانچہ پولس لکھتا ہے: ''مسیح نے اپنے آپ کو سب کے فدیہ میں دیا۔''

(تیمتھیس ۲:۲)

یہ تو تھا وہ مختصر واقعہ جس کی بنیاد پر پولس نے نظریہ کفارہ کی بنیاد رکھی۔ اگر اس کو تفصیل سے پڑھیں تو

اس میں بے شمار تضادات نظر آئیں گے اور ایسے سوالات جنم لیتے ہیں جن کا جواب آج تک عیسائی برادری سے نہیں بن سکا۔ یہاں اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ اگر علمائے عیسائیت کے نزدیک جناب مسیح علیہ السلام کا مصلوب ہونا تمام بنی آدم کا کفارہ ہے تو پھر تو سب کی نجات ہوگی۔ اب کیا ضرورت ہے عیسائیت قبول کرنے کی۔ کوئی عیسائی ہو یا یہودی، ہندو ہو یا مسلمان جب سب کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا تو عیسائیت کی بھی ضرورت نہ رہی۔ تو کیوں علمائے عیسائیت اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کیوں فری ڈسپنسریوں سکولوں کالجوں اور رفاہ عامہ کے کاموں کی آڑ میں مسیحیت کا پرچار کررہے ہیں۔

پوری عیسائیت بالخصوص نظریہ کفارہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے دیکھ لیں یہی معلوم ہوگا کہ یہ خدا کی شریعت کے باغی اور مجرم ذہنوں کا وضع کردہ ہے۔ جو دراصل تصور سزا ختم کر کے ہر طرح کے گناہوں اور جرائم سے اپنا دامن آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے تئیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں۔ اور جب سب ان نظریات کے حامل ہوجائیں گے تو اسے گویا ''آئینی حیثیت'' مل جائے گی۔ جب سزا و جزا کا تصور ختم ہوگیا تو کھلی چھٹی مل گئی۔ قتل کرو، زنا کرو، چوری کرو، حرام خوری کرو کسی طرح کی کوئی قدغن نہیں۔ یہاں ہم یہ نکتہ اٹھانے میں بھی حق بجانب ہیں کہ کفارہ کے اعتقاد کے بعد ان کے پاس اپنے ملکوں میں جرائم کی سزاؤں کے قوانین وضع کرنے کا کیا جواز ہے؟ کیا یہ عیسائیت کے ساتھ مذاق نہیں؟ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ کفارہ ادا ہو چکا تو پھر جرائم کی روک تھام کے لئے قوانین وضع کرنا، پولیس فورس تشکیل دینا اور عدلیہ کا نظام رائج کرنا چہ معنی دارد۔

اسلام اس نظریہ کو یکسر مسترد کرتا ہے اور دو ٹوک اور واضح موقف بیان کرتا ہے: ولا تزر وازرة وزر اخرى. (فاطر۔ آیت ۱۸) کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔ نیز فرمایا۔ "لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت. (بقرہ۔ ۲۸۶) ترجمہ: اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی۔ (ترجمہ اعلیٰحضرت)

گناہ بنی آدم نے کیا تو جناب مسیح علیہ السلام گناہ گار کیوں اور کیوں کسی کی سزا بھگتیں۔ گناہ کوئی کرے اور وبال کسی پر ہو یہ تو عدل و انصاف اور فکر و عقل کے تقاضوں کے خلاف ہے کوئی معقول اور

باشعور دماغ اس نظریہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ خود بائبل میں ایک جگہ اس کے خلاف بات کہی گئی ہے:

''بیٹوں کے بدلے باپ دادا نہ مارے جائیں اور نہ باپ دادا کے بدلے بیٹے مارے جائیں بلکہ ہر آدمی اپنے ہی گناہ کے لئے مارا جائے''۔

یہ سوال بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا خدا قادر مطلق نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے تو پھر وہ ''بیٹے کی قربانی'' اور فدیہ کے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسی تناظر میں دیکھیں تو سمجھ آجائے گی کہ خدا سے متعلق ان کا اعتقاد و یقین کتنا متفق اور کمزور ہے۔ ان کی نظر میں خدا کس قدر مجبور تھا (معاذ اللہ) کہ بغیر جناب عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیے وہ کسی کو بخش نہ سکتا تھا۔ پھر کفارہ پر مبنی انسان کی فلاح و نجات کے اس مزعومہ ''خدا کے منصوبے'' کا ایک اور مضحکہ خیز اور لغو پہلو یہ بھی ہے کہ مسیح جو اس کے مرکزی کردار ہیں وہ (ان کے نظریے کے مطابق) نہ تو اس کی ضرورت و اہمیت سے باخبر ہیں نہ دل و جان سے اس میں شریک۔ چنانچہ انجیل کہتی ہے:

''وہ غمگین اور بے قرار ہونے لگے اور منہ کے بل گر کر یوں دعا کرنے لگے کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے'' (متی) اگر وہ اس خدائی منصوبے میں شریک تھے تو پریشان ہونے اور یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ ''یہ پیالہ مجھ سے ٹال دے''۔

نیز اس مذہب کے پیشوا یہ ثابت کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام صلیب دیے گئے تھے۔ اس بارے میں یہ متفق نہیں ہیں اسی طرح ان کے صلیب دیے جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کی بات کسی ٹھوس دلیل کے بغیر کر گئے ہیں۔ جیسا کہ محققین نے اعتراف کیا:

(An) event .....which ,however , no eye saw.

''البتہ (جی اٹھنے) کا یہ واقعہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھا''

(Adolf Harnack: History of Dogma, London ,1961)

اور آخری بات یہ کہ اس میں بھی اناجیل کا اختلاف ہے کہ جی اٹھنے کے بعد وہ کہاں گئے۔ یہ ساری بحث تفصیل طلب تھی جسے ہم نے مختصر ترین شکل میں پیش کیا اور جو نتیجہ اس بحث سے برآمد ہوا وہ یہ

ہے کہ بقول ہیوشون فیلڈ (Dr.Hugh Schonfield)

"Christianity today is about as far from the teaching of Jesus as from those of Hinduism."

''آج کی عیسائیت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے اتنی دور ہے جتنی کہ وہ ہندومت کی تعلیمات سے دور ہے''

(TheDaily ,"Today " London ,March 28, 1986)

نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جدید عیسائیت کا ہر عقیدہ و نظریہ سراسر انسانی تفکرات و توہمات اور مکاشفات پر مبنی اور خدائی و نبوی تعلیمات سے دور ہے جبکہ اسلام اپنی اصل ترین شکل پر قائم تحریف وتبدل سے پاک اور خدا (جل جلالہ) و رسول (علیہ الصلوۃ والسلام) کی طرف سے عطا کردہ عقائد ونظریات اور تعلیمات پر مبنی سچا دین ہے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆
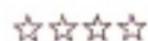
مقدمہ

توہینِ رسالت ننکانہ صاحب

از قلم حقیقت رقم: صادق علی زاہد☆

رسول اکرم ﷺ کی ذات، مسلمانوں کے لیے ان کی اپنی ذات سے بہت بڑھ کر ہے۔ آپ ﷺ کے بارے میں فحش گوئی اور بدکلامی سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچنا ایک لازمی وفطری عمل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی عزت وتکریم کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہی نہیں بلکہ بنیادِ ایمان ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اے نبی ﷺ بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاہد و مبشر اور نذیر بنا کر، تاکہ اے لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم وتوقیر کرو اور صبح وشام اللہ کی تسبیح (پاکی) بیان کرو'' (1) ''دوسری جگہ آپ ﷺ کی عزت وتوقیر کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی: ''پس جو لوگ اس رسول ﷺ پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اسکی مدد کریں اور اس نور کی اتباع کریں جو اس کے ساتھ اترا، وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔'' (2) نبی اکرم ﷺ کی عزت وتوقیر کس حد تک کی جائے اس بارے میں ارشادِ ربانی ملاحظہ فرمائیں۔ ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو اور ان کی موجودگی میں بلند آواز سے بات نہ کرو جس طرح بلند آواز سے تم ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے'' (3)

صحابہ کرام تو پہلے ہی مجسم ادب تھے لیکن اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد ادب واحترام رسول ﷺ کے بارے میں مزید محتاط ہو گئے۔ خود ہی محتاط نہ ہوئے بلکہ دوسروں کو بھی بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہونے سے قبل ''آدابِ باریابی'' سے مطلع فرماتے۔ کتب سیر میں مرقوم ہے کہ اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے معمول بنا لیا تھا کہ جب بھی کوئی بیرونی وفد آپ ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ طیبہ پہنچتا تو آپ رضی اللہ عنہ وفد کی طرف ایک خاص

☆0300-4529446

آدمی کو روانہ کرتے جو اس وفد میں شامل لوگوں کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری اور بات چیت کے آداب سے آگاہ کرتا۔ ایسے الفاظ جن میں توہین رسالت ﷺ کا شائبہ بھی موجود ہو ان کے استعمال سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا! ''اے ایمان والو (جب تم رسول ﷺ سے بات کرو تو) ''راعنا'' نہ کہو بلکہ یوں عرض کرو کہ حضور ﷺ ہم پر نظر فرمائیے اور (جب حضور ﷺ ارشاد فرما رہے ہوں تو) غور سے سنا کرو (تاکہ بار بار تم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر آپ ﷺ کو تکلیف محسوس نہ ہو) (4) اتنی واضح تعلیمات کے باوجود اگر کوئی بدبخت حضور ﷺ کے ناموس کے بارے میں ناپسندیدہ عمل کرے تو اس کا کیا حشر ہوگا، ارشاد ربانی ہے! ''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ہلاک کیا جائے گا جس طرح ان لوگوں کو ہلاک کیا گیا جو ان سے پہلے تھے۔'' (5)

مزید فرمایا! ''جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں یہ ذلیل ترین لوگ ہیں''۔ (6) ناموس رسالت کا پاس نہ رکھنے والوں سے مومنین کا کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے ارشاد ربانی ہے! ''جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، تم انہیں خدا اور رسول ﷺ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔'' (7) شاتمان رسالت کو سزا سے بچانے کیلئے قوانین میں ترمیم کرنے والوں اور گستاخان رسول کی وکالت کر کے انہیں سزا سے بچانے کی کوشش کرنے والوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے اس حکم ربانی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ حکومت وقت سے گذارش ہے کہ غیرت مسلماں کا امتحان لینے سے باز رہے۔ اقتدار کے نشے میں سرمست ہو کر جس نے بھی گستاخان رسول کی پشت پناہی کی کوشش کی اس کی دنیا و آخرت تباہ ہونے کا اشارہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''جان لو! بے شک نبی کریم ﷺ کی عزت و حرمت اور آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح ضروری و لازم ہے۔ جس طرح آپ ﷺ کی ظاہری حیات میں ضروری و لازم تھی۔ اس کا اظہار خصوصاً آپ ﷺ کے ذکر مبارک، آپ ﷺ کی حدیث شریف کی تلاوت، آپ ﷺ کی سنت، آپ ﷺ کے نام مبارک اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے سننے کے وقت ہونا چاہئے۔'' (8)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے!

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید، جنید و بایزید ایں جا

ان دنوں میڈیا پر ننکانہ صاحب میں توہین رسالت کی مرتکب آسیہ نامی عیسائی عورت کو جناب محمد نوید اقبال صاحب ایڈیشنل سیشن جج ننکانہ صاحب کی طرف سے سزائے موت سنائے جانے کے خلاف بہت کچھ کہا سنا جا رہا ہے خصوصاً گورنر پنجاب سلمان تاثیر غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنے کی خاطر ہر قسم کی قانونی واخلاقی حدیں پھلانگ رہا ہے۔ میڈیا اصل حقائق عوام تک نہیں پہنچا رہا بلکہ سرکاری بولی بول رہا ہے۔ ننکانہ صاحب کا مقامی شہری ہونے کی حیثیت سے میں نے مناسب سمجھا کہ اصل حقائق قارئین تک پہنچا دیے جائیں۔

آسیہ نامی عیسائی عورت ننکانہ صاحب کے نواحی گاؤں اٹانوالی چک نمبر 3 گ ب تھانہ صدر ننکانہ صاحب کی رہائشی ہے۔ اس کا کردار پورے گاؤں میں قابل اعتراض مشہور ہے۔ مادر پدر آزادی کی دلدادہ ہے۔ سر عام قابل اعتراض گفتگو کرتی ہے۔ اس کی بڑی بہن کی شادی اس کے نام نہاد خاوند عاشق کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس سے اس کے خاوند کے تین بچے موجود ہیں۔ جب اس کی بڑی بہن کو بچے کی امیدواری ہوئی اور زچگی کے دن قریب آئے تو آسیہ اپنی بہن کے گھر کا کام کاج کرنے اس کے گھر آگئی۔ اپنی بہن کے گھر چند دن رہائش کے دوران اس کے خاوند (جو کہ اب آسیہ کا بھی خاوند ہی بن چکا ہے) سے ناجائز تعلقات قائم کر لئے۔ اور حاملہ ہو گئی۔ والدین نے حمل چھپانے کی غرض سے شادی کرنا چاہی تو اس نے اپنی بہن کے خاوند عاشق مسیح کے سوا کسی اور سے شادی کروانے سے انکار کر دیا بلکہ بغاوت کر کے زبردستی عاشق کے گھر رہنے لگی اور عاشق اپنی بیوی کے گھر موجود ہونے کے باوجود راتیں آسیہ کے ساتھ بسر کرنے لگا۔ اس پر بیوی نے سخت احتجاج کیا تو عاشق نے مار پیٹ کر اسے گھر سے نکال دیا اب اصل بیوی، بے گھر اور ساتی گھر والی بن کر زندگی گزارنے لگی۔ (ایسی حرکت پر ہی پنجابی میں کہا جاتا ہے "اگ لین آئی تے گھر دی مالک بن بیٹھی) عیسائی مذہب میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے

دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ،لیکن آسیہ نے اہل دیہہ اور برادری والوں کے اصرار کے باوجود عاشق کے گھر سے جانے سے انکار کر دیا۔ آسیہ اور عاشق کے اس خلاف مذہب اقدام پر عیسائی برادری نے بھی سخت احتجاج کیا اور ان کا معاشرتی بائیکاٹ کرنے کی دھمکیاں دیں لیکن دونوں نے کسی بات کی پروانہ کی اور شادی کا سوانگ رچا ڈالا۔ دنیا کے دکھاوے کے لئے ،مذہبی روایات کے برعکس عاشق نے آسیہ سے نام نہاد شادی کر لی اور دونوں بہنوں کو اکٹھا اپنے گھر آباد کر لیا جو کہ آج بھی دونوں حقیقی بہنیں عاشق کے گھر آباد ہیں آسیہ قدرے پڑھی لکھی اور ''روشن خیال'' عورت ہے اسی روشن خیالی کی وجہ سے NGO,S کی آنکھ کا تارا بن گئی اور علاقے میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے لگی۔ دیہات میں چونکہ عورتیں کھیتوں میں مزدوری کرتی ہیں، آسیہ نے یہ طریقہ بنا رکھا تھا کہ عورتوں کے ساتھ مزدوری کے بہانے چلی جاتی اور اپنے ساتھ کام کرتی عورتوں کو باتوں باتوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتی۔

اسی معمول کے مطابق 14/06/2009 کو گاؤں کی عورتیں ادریس نامی زمیندار کے کھیتوں میں فالسہ کے باغ میں فالسہ توڑنے گئیں آسیہ بھی ان عورتوں میں موجود تھی۔ عورتیں عام طور پر دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھیتوں میں لے جاتی ہیں۔ جب عورتیں دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھیں تو آسیہ نے مافیہ بی بی، آسیہ بی بی دختران عبدالستار کے گلاس میں پانی پی لیا۔ انہوں نے اس کے جھوٹے گلاس میں پانی پینے کی بجائے اپنا سالن والا برتن خالی کر کے اس میں پانی پی لیا۔ اس بات کو آسیہ نے اپنی توہین سمجھ کر دونوں بچیوں کے ساتھ تو تکار کر کے مذہبی گفتگو شروع کر دی۔ دوران گفتگو آسیہ نے نبی اکرم ﷺ اور قرآن مجید کے بارے میں انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ جن کا خلاصہ اس طرح سے ہے۔

''تمہارے نبی موت سے ایک ماہ قبل سخت بیمار پڑے رہے۔ حتی کی تمہارے نبی کے منہ اور کانوں میں (نعوذ باللہ) کیڑے پڑ گئے تھے۔ تمہارے نبی نے مال و دولت کے لالچ میں خدیجہ سے شادی کی اور مال و دولت بٹورنے کے بعد اسے گھر سے نکال دیا۔ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود سے بنائی گئی کتاب ہے۔''

یہ باتیں مافیہ بی بی، آسیہ بی بی دختران عبدالستار کے علاوہ یاسمین دختر اللہ رکھا اور کھیت میں موجود دیگر کئی عورتوں نے سنیں تو مسلمان عورتوں کا مشتعل ہونا ایک فطری عمل تھا انھوں نے آسیہ کو اپنا منہ بند رکھنے اور اپنے الفاظ واپس لینے کی بابت کہا آسیہ کے انکار پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ جھگڑے کا شور سن کر کھیت کا مالک ادریس اور اس کی بیوی جو قریبی ڈیرہ پر موجود تھے موقع پر آ گئے، معاملہ سنا اور آسیہ نے مذکورہ بیان شدہ الفاظ کا کہنا تسلیم کیا۔ ادریس نے اسے اپنے کھیتوں میں سے چلے جانے کا کہا تو وہ چلی گئی۔ مسلمان عورتوں نے گاؤں پہنچ کر یہ بات اپنے اپنے گھروں میں کی تو گاؤں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور گاؤں کے معززافراد پر مشتمل پنچایت اکٹھی ہوئی جس میں عیسائی لوگ بھی موجود تھے۔ آسیہ کو بلا کر مذکورہ گفتگو کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے ان الفاظ کا کہنا تسلیم کیا اور معافی بھی مانگی۔ اس پر گاؤں میں مزید اشتعال پیدا ہو گیا۔ اور لوگ آسیہ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ گاؤں کے نمبردار نے گاؤں والوں کو سمجھایا کہ اس نے جو جرم کیا ہے اس کی سزا موت ہی ہے۔ جو عدالت اسے دے گی تم اسے قتل کر کے کیوں اپنے ذمے جرم لیتے ہو۔ اور اس طرح قتل کر دیے جانے سے دیگر ممالک میں پاکستان کی جگ ہنسائی کا بھی اندیشہ ہے، مناسب ہے کہ اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے۔" نمبردار صاحب کے سمجھانے پر گاؤں والوں نے اس کے خلاف قاری محمد سالم کی مدعیت میں تھانہ صدر ننکانہ صاحب میں برائے اندراج مقدمہ درخواست گذاری تو، **19/06/2010** کو پولیس نے مقدمہ نمبر **326/09** بجرم **295/C** درج کر کے تفتیش محمد ارشد ڈوگر **SI** کے سپرد ہوئی۔ جس نے ریڈ کر کے ملزمہ کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا اور اس کا ڈاکٹری معاینہ کرانے کی استدعا عدالت سے کی لیکن ملزمہ نے ڈاکٹری معاینہ کرانے سے انکار کر دیا۔ ملزمہ سے کوئی برآمدگی مطلوب نہ ہونے کی بنا پر اسی دن اُسے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر کے جوڈیشل جیل شیخوپورہ بھیج دیا گیا۔ اس مقدمہ کی اطلاع جب **RPO** شیخوپورہ ریج کو ہوئی تو اس نے اس مقدمہ کی حساسیت کے پیش نظر بروئے چٹھی انگریزی نمبری **18523-26/Leagal** مورخہ **24/06/2009** اس کی تفتیش سید محمد امین بخاری **SP** انویسٹی گیشن شیخوپورہ کے سپرد کر دی۔ سید محمد امین بخاری **SP** انویسٹی گیشن شیخوپورہ نے مثل مقدمہ طلب کر

کے ملاحظہ کی اور فریقین کو مورخہ 29/06/2009 کو اپنے دفتر طلب کیا۔ 29/06/2009 کو مدعی فریق کی جانب سے گواہان FIR سمیت 27 افراد نے جبکہ ملزمہ کی جانب سے 04 افراد نے پیش ہو کر اپنے بیانات ریکارڈ کروائے۔ وہاں پر ملزمہ آسیہ کے خاوند عاشق مسیح نے آسیہ کی برحلف صفائی دینے سے انکار کر دیا۔ فریقین کے بیانات سے جو کہ ضمنی نمبر 03 مرتبہ مورخہ 29/06/2009 میں مفصل درج ہیں۔ بیانات سننے کے بعد ضمنی نمبر 03 پیرو نمبر 12 میں لکھا کہ ''معاملہ سنگین ہے۔ ریڈر خود کو حکم کیا کہ ادریس نامی کاشتکار جس کے کھیتوں میں وقوعہ ہوا ہے اسے بھی طلب کیا جائے اور ملزمہ جیل میں بند ہے اس سے ملاقات کے لئے سپرنٹنڈنٹ جیل کو درخواست لکھی جائے'' مورخہ 04/07/2009 کو محمد ادریس مذکور نے SP انویسٹی گیشن کے روبرو پیش ہو کر اپنا مفصل بیان ریکارڈ کروا دیا جو کہ ضمنی نمبر 04 مرتبہ 04/07/2009 میں مفصل درج شدہ ہے۔ محمد ادریس نے بتایا کہ وقوعہ کے بعد گاؤں میں حاجی علی احمد کے ڈیرہ پر اکٹھ ہوا جہاں لوگوں کی موجودگی میں ملزمہ نے حضور پاک ﷺ کی شان میں گستاخانہ باتیں کرنے کا اعتراف کیا۔ جبکہ اسی دن ریڈر SP انویسٹی گیشن نے علاقہ مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں ملزمہ سے جیل میں دریافت حالات کرنے کی اجازت طلب کی جو اسی دن اجازت دے دی گئی۔ تو مورخہ 06/07/2009 کو SP انویسٹی گیشن شیخوپورہ معہ عملہ متعلقہ ڈسٹرکٹ جیل شیخوپورہ پہنچا ملزمہ آسیہ سے جیل کے اندر ملاقات کر کے دریافت حالات کی اور اپنی مرتبہ ضمنی نمبر 05 پیرہ نمبر 05 میں لکھا کہ ''مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں مسمات آسیہ بی بی کا حضور پاک ﷺ کی شان میں اور قرآن پاک کے متعلق گستاخانہ باتیں کرنا ثابت ہوا ہے جو مقدمہ ہذا میں صحیح گنہگار پائی گئی ہے'' اپنی تفتیش مکمل کر کے ملزمہ کو گنہگار لکھ کر مثل واپس تھانہ صدر ننکانہ صاحب ارسال کر دی۔ جہاں سے مورخہ 12/07/2009 کو محمد ایوب I/SHO تھانہ صدر نے حالات تفتیش مقدمہ کی روشنی میں ملزمہ کو گنہگار قرار دیکر مثل چالان مقدمہ مکمل کر کے ہمراہ بیانات گواہان متعلقہ دفتر میں جمع کرا دیا۔ جو کہ معمول کے مطابق 14/09/2009 کو چالان عدالت میں پہنچا اور سماعت جناب نوید اقبال صاحب ایڈیشنل سیشن جج ننکانہ صاحب کے سپرد ہوئی۔ 03/10/2009 جناب محمد نوید اقبال ایڈیشنل سیشن جج صاحب ننکانہ صاحب نے

ملزمہ پر فرد جرم عائد کر کے مقدمہ کی باقاعدہ کاروائی کا آغاز کیا۔ استغاثہ کی طرف سے جناب میاں ذوالفقار علی ایڈووکیٹ جبکہ ملزمہ کی طرف سے وکلاء کا ایک مضبوط پینل جن میں ایس کے چوہدری، سید رشید حسین اور میاں محمد اجمل ایڈووکیٹس شامل ہیں عدالت میں پیش ہوتا رہا۔ پرائیویٹ گواہان ہر تاریخ پیشی پر عدالت میں حاضر ہوتے رہے لیکن کبھی وکلاء کی ہڑتال اور کبھی معزز جج صاحب کی چھٹی کی وجہ سے کئی ماہ تک گواہان کے بیانات ریکارڈ نہ ہو سکے۔ بالآخر 01/06/2010 گواہان استغاثہ قاری محمد سالم، مافیہ بی بی، عاصمہ بی بی محمد افضل نے، 15/06/201 کو محمد رضوان SI نے، 06/07/2010 محمد ارشد سب انسپکٹر (تفتیشی افسر) اور سید محمد امین بخاری SP انویسٹی گیشن شیخوپورہ (تفتیشی افسر) نے، 01/10/2010 کو محمد ادریس (جس کے فالسہ کے باغ میں وقوعہ ہوا تھا) نے بطور گواہ عدالت میں پیش ہو کر اپنا بیان قلمبند کرایا۔ جبکہ 20/10/2010 کو ملزمہ کا بیان ریکارڈ ہوا۔ کئی ماہ تک مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اسی دوران ملزمہ نے سیشن کورٹ اور ہائی کورٹ میں درخواست ہائے ضمانت پیش کیں جو نامنظور ہوئیں۔ سماعت مکمل ہونے پر ملزمہ گناہ گار ثابت ہو گئی تو مورخہ 08/11/2010 کو جناب محمد نوید اقبال صاحب ایڈیشنل سیشن جج صاحب ننکانہ صاحب نے ملزمہ کو سزائے موت اور ایک لاکھ روپے جرمانہ کی سنادی۔ ملزمہ کے وکیل رائے اجمل ایڈووکیٹ نے فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ جناب نوید اقبال صاحب نے میرٹ پر فیصلہ کیا ہے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران مجھے کوئی تعصب نظر نہیں آیا۔ ملزمہ آسیہ کے دفاع میں شہادت کمزور ہونے کی بنا پر میں نے شہادت عدالت میں پیش نہیں کی۔ وکیل موصوف کا یہ بیان مورخہ 26/11/2010 ملکی اخبارات میں شائع ہوا۔ مکمل پولیس ریکارڈ جس میں مدعی، گواہان، ملزمہ اور پولیس کے مفصل بیانات لگے ہوئے ہیں اور مفصل عدالتی فیصلہ جس میں پورے مقدمہ کا خلاصہ اور حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد سزائے موت سنائی گئی ہے، کی فوٹو سٹیٹ کاپی میرے پاس موجود ہے جس کی روشنی میں یہ تحریر تیار کی جا رہی ہے۔

اگلے دن معمول کے مطابق یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو میڈیا میں شور برپا ہو گیا جو آج

تک جاری ہے۔ گورنر پنجاب جناب سلمان تاثیر صاحب اس سلسلہ میں بہت پیچ وتاب کھا رہے ہیں 20/11/2010 کو گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے اپنی بیٹیوں اور بیوی کو ساتھ لے کر جیل کے اندر ملزمہ سے ملاقات کی، ملزمہ کو اپنے ساتھ بٹھا کر پریس کانفرنس کی۔ پولیس اور عدلیہ کی کئی ماہ کی انکوائری اور تحقیقات پر بیٹھے بٹھائے قلم پھیر کر ملزمہ کو بے گناہ قرار دے دیا اور اسے جلد ہی بری کر دیئے جانے کی نوید سنا کر اور ایک درخواست پر دستخط کروا کر چلے گئے۔ میڈیا پر یہ خبر بھی آ چکی ہے کہ ملزمہ کو شیخوپورہ جیل سے کہیں نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

اپنا دینی اور ملی فریضہ سمجھتے ہوئے، میں صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری اور گورنر پنجاب جناب سلمان تاثیر صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا پاکستان میں ''اندھیر نگری اور چوپٹ راج'' والا معاملہ کیا جا رہا ہے؟؟ ابھی تو سیشن کورٹ ٹرائل ہوا ہے اس کے بعد ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی معزز عدالتیں موجود ہیں ان عدالتوں سے ٹرائل کے بعد صدر کے پاس اپیل کی باری آئے گی۔ اگر مجرمہ بے گناہ ثابت ہوگئی تو عدالتیں اسے بری کرنے میں آزاد ہیں۔ اگر گورنر اور صدر آصف زرداری نے سب عدالتوں کو بائی پاس کر کے مغربی خداؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر سیشن کورٹ کے فیصلہ پر ہی پیچ وتاب کھا کر مجرمہ کی رہائی کے غیر قانونی اور ناپاک منصوبے بنا رکھے ہیں تو ایک آرڈیننس جاری کر کے عدالتی نظام جو ان کے کئی ''منصوبوں'' کو روکے ہوئے ہے، ختم کر دیں اور خود ہی اپنی مرضی کے فیصلے کرتے جائیں۔ لیکن جب تک عدالتیں قائم ہیں ان کا احترام گورنر اور صدر مملکت کو عام پاکستانی شہری سے بدرجہا بڑھ کر کرنا ہوگا تاکہ عوام ان کی تقلید میں قانون کا احترام سیکھ سکیں۔ عقلمند لوگ دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھتے ہیں آپ لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ حضور نبی رحمت ﷺ کا نام ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا مگر تمہارے اعمال کی وجہ سے۔

ع تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں

ابھی بھی وقت ہے ہوش کے ناخن لو اور اللہ اور اس کے رسول کی عزت کی حفاظت کا ڈنکا بجا دو وہ زمانے میں تمہاری عزت کا سامان پیدا کر دے گا۔ عیسائی آج بھی توہین عیسیٰ علیہ السلام پر

سزائے موت دینے پر قائم ہیں لیکن نام نہاد مسلمان لیڈر توہین رسالت کے قانون کی طرح طرح کی تاویلیں کرکے اس کی روح کو سبوتاژ کرنے کے درپے ہیں۔ یورپی ممالک اسلام سے برگشتہ اور اسلامی تعلیمات پر نکتہ چینی کرنے والے انھیں نام نہاد مسلمانوں کو جس طرح عزت وتوقیر سے نوازتے ہیں، یہ سراسر قابلِ اعتراض اور اشتعال انگیز حرکت ہے۔ گستاخ رسول، ملعون سلمان رشدی ہو یا تسلیمہ نسرین، ملعون کارٹونسٹ ہو یا شاتمہ آسیہ انھیں امریکہ ویورپ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور میڈیا میں انہیں ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جو کہ امریکہ ویورپ کے اسلام کے خلاف اندرونی بغض وعناد کا کھلم کھلا اظہار ہے۔ مغربی دنیا کی بھرپور کوشش ہے کہ روشن خیالی، آزاد روی اور جدیدیت کے نام پر مسلمانوں کو ان کے بنیادی اعتقادات سے بھی دور کر دیا جائے۔ ان حالات میں سب اسلامیان پاکستان سے گذارش ہے کہ اپنے وسائل اور اختیارات کے مطابق ہر فورم پر احتجاج کرکے اس دریدہ دہن عورت کو کیفر کردار تک پہنچانے اور قانون توہین رسالت کی روح کو بچانے میں اپنا حصہ اپنے تمام تر وسائل سمیت ڈال کر عند اللہ اور عند رسول اللہ ﷺ سرخرو ہوں۔

حواشی:

۱) سورت الفتح۔ آیت ۹ (۲) سورت الاعراف۔ آیت ۱۵۷ (۳) سورت الحجرات۔ آیت ۲

۴) سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۰۶ (۵) سورت المجادلہ آیت ۵ (۶) سورت المجادلہ۔ ۲۰ آیت

۷) سورت المجادلہ۔ آیت ۲۲ (۸) کتاب الشفاء از قاضی عیاض علیہ الرحمہ

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

ایف۔ آئی۔ آر
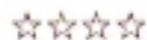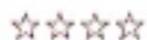
ابتدائی رپورٹ نسبت جرم قابل دست اندازی پولیس رپورٹ شدہ زیر دفعہ 154 مجموعہ ضابطہ فوجداری نمبر 326/9 15682 تھانہ صدر ننکانہ ضلع ننکانہ صاحب تاریخ ووقت وقوعہ 14/04/09

1	تاریخ ووقت رپورٹ	بحوالہ 23/19-06-09 بوقت 6/15 بجے شام	6	تھانہ سے روانگی کی تاریخ ووقت	سپیشل رپورٹ

2	نام وسکونت اطلاع دہندہ ومستغیث	درخواست ازاں قاری محمد سالم ولد حافظ غلام جیلانی قوم اعوان سکنہ چک نمبر 3 اِٹانوالی مرسلہ مہدی حسن ASI تھانہ صدر ننکانہ
3	مختصر کیفیت جرم (معہ دفعہ) ومال اگر کچھ کھویا گیا ہے۔	جرم 295/C
4	جائے وقوعہ وفاصلہ تھانہ سے اور سمت	بحد رقبہ چک نمبر 3 اِٹانوالی بفاصلہ 7 میل جانب شمال از تھانہ
5	کاروائی متعلقہ تفتیش اگر اطلاع درج کرنے میں کچھ توقف ہوا ہو تو اس کی وجہ بیان کی جائے	بلا توقف

دستخط محمد رضوان Asi   عہدہ محرر

(ابتدائی اطلاع نیچے درج کرو)

نوٹ: اطلاع کے نیچے اطلاع دہندہ کا دستخط یا مہر یا نشان انگوٹھا ہونا چاہیے اور افسر تحریر کنندہ (ابتدائی اطلاع) کے دستخط بطور تصدیق ہونے چاہئیں بخدمت جناب SHO صاحب تھانہ صدر ننکانہ صاحب جناب عالی گذارش ہے کہ سائل چک نمبر 3 گ ب اِٹانوالی تھانہ صدر ننکانہ صاحب

تحصیل وضلع ننکانہ صاحب کا رہائشی ہے اور مسجد صدیق اکبر میں بطور امام مسجد خدمات سرانجام دے رہا ہے مورخہ 14/06/09 کو بروز اتوار ادریس ولد احمد علی قوم آرائیں سکنہ دیہہ کی زمین میں آسیہ زوجہ عاشق مسیح جو عیسائی مذہب کی مبلغہ ہے گاؤں کی دیگر عورتوں جن میں عاصمہ بی بی دختر عبدالستار۔ مافیہ بی بی دختر عبدالستار۔ یاسمین دختر اللہ رکھا شامل ہیں فالسہ توڑ رہی تھیں آسیہ الزام علیہا نے کہا آپ مسلمانوں کے نبی (معاذ اللہ) کیا ہیں وہ وفات سے صرف ایک ماہ قبل چارپائی پر بیمار پڑے رہے اور تمہارے نبی کے منہ اور کانوں میں کیڑے پڑے۔ اور تمہارے (نبی ﷺ) نے حضرت خدیجہؓ سے محض مال کی خاطر شادی کی اور مال لوٹنے کے بعد انہیں گھر سے نکال دیا۔ مزید قرآن پاک کے متعلق کہا کہ وہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود بنائی گئی کتاب ہے۔ یہ سب باتیں عاصمہ بی بی۔ مافیہ۔ یاسمین مذکوران ودیگران نے مجھے اور گاؤں کے لوگوں کو بتائیں آج مورخہ 19/06/09 کو سائل معہ محمد افضل ولد محمد طفیل قوم گجر۔ مختار احمد ولد مشتاق احمد قوم راجپوت ساکنان دیہہ نے عاصمہ بی بی وغیرہ اور آسیہ الزام علیہا کو بلوایا اور 14/06/09 کے وقوعہ کے متعلق آسیہ مذکوریہ سے پوچھا تو اس نے اقرار کیا کہ مجھ سے واقعی میں نے نبی کریم اور قرآن پاک کی توہین کی مرتکب ہوئی ہوں اور معافی مانگتی ہوں۔ آسیہ مذکوریہ ملزمہ نے توہین رسالت ﷺ اور توہین قرآن کا ارتکاب کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے دعویدار ہوں آسیہ ملزمہ مذکوریہ کے خلاف توہین رسالت ﷺ اور توہین قرآن پاک کرنے پر مقدمہ درج کر کے کارروائی مطابق قانون کی جاوے عرضے دستخط اردو قاری محمد سالم ولد حافظ غلام جیلانی قوم اعوان سکنہ چک نمبر 3 اٹانوالی تحصیل وضلع ننکانہ (امام مسجد صدیق اکبر چک نمبر 3 اٹانوالی)

کارروائی پولیس: اس وقت میں معہ کانسٹیبل ارشد علی 842/C کانسٹیبل نبیل نواز 909/C بسواری سرکاری گاڑی نمبری 7631/SAG جس کا ڈرائیور محمد یسین نمبر 468/C برائے گشت نکل نمبر چندر کوٹ موجود ہوں کہ مسمی قاری محمد سالم مستغیث مذکور نے میرے پیش ہو کر درخواست مضمون بالا میرے پیش کی میں نے سردست جرم 295/C پائی جا کر درخواست ہذا بغرض اندراج مقدمہ بدست کانسٹیبل محمد ارشد 842/C ارسال تھانہ ہے مقدمہ درج کر کے نمبر مقدمہ سے اطلاع دی جاوے میں معہ ہمراہی

ملازمان بغرض تفتیش روانہ موقع کا ہوتا ہوں نیز سپیشل رپورٹ ہائے جابجا افسران مجاز بھجوائی جاویں دستخط اردو مہدی حسن Asi تھانہ صدر ننکانہ صاحب از ٹیل نمبر چندر کورٹ بوقت 5/45 بجے شام۔

از تھانہ: حسب آمدہ درخواست مضمون بالا مقدمہ عنوان بالا درج رجسٹر کر کے اصل درخواست معہ نقل FIR بغرض تفتیش بدست آرندہ کانسٹیبل عقب بوجہ معاملہ سنگین نوعیت محمد ارشد ڈوگر Si ارسال ہے نیز سپیشل رپورٹ ہائے جابجا افسران مجاز بھجوائی جارہی ہیں دستخط اردو محمد رضوان Asi محرر تھانہ صدر ننکانہ صاحب 19/06/09

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

اسلام کا نظریۂ حدود و تعزیرات

مفتی سید صابر حسین (کراچی) ☆

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو سلیم بنایا ہے یعنی یہ باعتبار اصل سلیم الطبع ہے۔ جب کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرت سلیم کے ساتھ آتا ہے، جسے قرآن "فِطْرَتَ اللّٰهِ" کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ (سورۂ روم، آیت نمبر ۳۰) لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت میں شر و باطل، فتنہ و فساد کو قبول کرنے اور جرائم کے کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ☆ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ☆ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ☆ پھر سمجھ دی اسکو بدکاری کی اور بچ کر چلنے کی، لہذا جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے معصیت کی وہ ناکام ہوگیا۔ (سورۂ شمس، آیت نمبر ۸ تا ۱۰)۔ اسی طرح مشہور حدیث شریف ہے کہ ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن یہ اس کے والدین ہیں، جو اسے یہودی نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ اگرچہ انسان کی فطرت سلیم ہے لیکن وہ اپنے ماحول کے اثرات بد کو قبول کر کے گناہ و سرکشی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔

انسان کی فطرت سلیم ہے؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بارہا وہ اپنی زندگی میں اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ خدانخواستہ اس سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو ابتداء وہ اپنے اندر ایک کشمکش پاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے واقعی کچھ غلط کر دیا ہے۔ دراصل یہ اس کی فطرت سلیمہ ہی ہے، جو اسے احساس

0321-2880864 ☆

دلداری ہوتی ہے۔ نیکیوں پر سکون و طمانیت کا حاصل ہونا اور گناہوں پر نادم و پشیمان اور پریشان رہنا بھی فطرت کے سلیم ہونے کا بین ثبوت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ بھی اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیکی وہ ہے، جس سے دل میں اطمینان ہو اور گناہ وہ ہے، جو دل میں کھٹکے۔ لیکن یہی شخص جب اس جرم کو بار بار کرتا رہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کے اندر کی یہ کشمکش دم توڑ دیتی ہے، پھر وہ گناہوں اور جرائم کا اس قدر خوگر ہو جاتا ہے کہ کسی بھی قسم کے گناہ پر اُسے ندامت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود کو حق پر سمجھنے لگتا ہے۔

لہٰذا جب یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ انسان میں جرائم کرنے اور زمین پر شر و فساد پھیلانے کی رغبت موجود ہے اور جرائم معاشرے کی بگاڑ اور امن و امان کو غارت کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، تو ان کی روک تھام اور سدِ باب کے لئے شریعت نے حدود و قصاص اور تعزیرات کا نظریہ دیا۔ ان حدود و تعزیرات کے مقاصد میں انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت واضح کرنے اور مجرم کو قرار واقعی سزا دے کر اُسے آخرت کی سزا سے بچانے کے ساتھ ساتھ ایک اہم مقصد جرائم کو ختم کرنا اور معاشرے میں امن و آشتی کو پروان چڑھانا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۹ سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ حدود و قصاص کے نفاذ میں ہی انسانیت کی بقا مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ☆ ترجمہ: اور اے عقل مند لوگو! تمہارے لئے خون کا بدلہ (مشروع کرنے) میں زندگی ہے تاکہ تم (ناحق قتل کرنے سے) بچو۔ اور قرآن مجید کی سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۴۴، ۴۵، ۴۶ میں بالترتیب اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کو کفر، ظلم اور فسق وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ قارئین کرام کی معلومات کے لئے یہ بھی تحریر کرتا چلوں کہ حدود و قصاص اور تعزیرات دونوں ہی سزاؤں کی صورتیں ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ حدود و قصاص کی سزائیں شریعت کی متعین کردہ ہیں، جن میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کا کسی کو اختیار نہیں بلکہ بعینہٖ اُسے نافذ کیا جائیگا۔ البتہ تعزیرات کا نفاذ حاکم وقت یا قاضی کی صوابدید پر ہوتا ہے اور وہ اس کا تعین جرم کی نوعیت

مجرم کے سابقہ ریکارڈ اور عرف (Customary Practice) وتعامل کو مدِ نظر رکھ کر سکتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود وقصاص کے بلا تفریق نفاذ سے لوگوں میں جرائم کے ارتکاب کی رغبت کم ہو جاتی ہے اور کیوں نہ ہو، جب ایک شخص کو بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے لوگوں کے سامنے شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق سزا دی جائے تو وہاں پر موجود کوئی بھی شخص اس جرم کو کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ گویا ایک شخص (جو کہ مجرم ہے) کو سزا دے کر پورے معاشرے کو ارتکاب جرم سے بچایا جا سکتا ہے اور حدود وتعزیرات کے نفاذ میں سب سے اہم مقصد یہی ہے۔ اسلامی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں میں حدود وتعزیرات کو عملاً نافذ کیا جاتا رہا اس وقت تک ان میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس تناظر میں اگر خلافتِ راشدہ کے دور کو دیکھا جائے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ مبارک ہمیں بے مثال و یکتا نظر آتا ہے، جس میں حدود و قصاص سے لے کر تعزیرات تک کا عملی نفاذ نظر آتا ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنی نگرانی میں حدود وتعزیرات قائم فرمایا کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں سعودی عرب میں کسی حد تک حدود وتعزیرات کو عملاً قائم کیا جا رہا ہے، جس کے مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں کہ وہاں جرائم کی شرح دوسرے مسلم ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ وہاں کے لوگوں میں اپنی جان، مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا احساس اس قدر زیادہ ہے کہ وہاں پر دکاندار بلا خوف وخطر اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر نماز کی ادائیگی اور دوسرے کاموں کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اگر دوسرے اسلامی ممالک بھی اسی طرح کا طرزِ عمل اپنائیں تو یقیناً بہت فائدہ ہوگا۔

آج ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اولاً تو اسلامی حدود وتعزیرات کو معطل کر دیا گیا اور کسی قدر ان کا نفاذ ہے بھی تو حقیقی معنوں میں ان کے ثمرات معاشرے میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون وقت کے گذرنے کے ساتھ اپنی اہمیت وافادیت کھو بیٹھا ہے جیسا کہ بعض نام نہاد مغرب زدہ دانشوروں کا خیال ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب کہیں قومی مفاہمتی حکم

نامے (National Reconciliation Order-NRO) کے نام سے مجرموں کے لئے گنجائش نکالنے کی غیر شرعی اور غیر قانونی کوششیں ہو رہی ہوں، کہیں سیاسی مفادات اور کہیں ذاتی مفادات محفوظ ہوں، قومی خزانے کو لوٹنے والے کا جرم ثابت ہو جانے اور عدالتِ عالیہ سے سزا مل جانے کے باوجود صدارتی حکم نامہ (Executive Order) کے تحت معافی کا پروانہ دیا جا رہا ہو، میڈیا پر جرم اور مجرم کی بھرپور تشہیر ہو رہی ہو لیکن اس پر سزا نہ دی جا رہی ہو یا ملنے والی سزا کی تشہیر جرم اور مجرم کی تشہیر کے مقابلے میں بالکل نہ ہو، اسی طرح جب مجرم کے دل سے سزا کے ملنے کا خوف ختم ہو جائے بلکہ جرم کرنے پر اُسے تحفظ ملنے کا یقین ہو تو پھر جرائم کیسے ختم ہوں گے اور حدود و تعزیرات کے اثرات معاشرے پر کس طرح مرتب ہوں گے۔

آج پاکستان میں ہر طرف قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم ہے، اس کی یہی وجہ تو ہے کہ مجرم کو کسی کا خوف نہیں وہ خود کو شرعی و ملکی قوانین سے بالاتر سمجھتے ہیں لہذا جو چاہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل (Transprency International) کی حالیہ رپورٹ میں پاکستان کو ۳۴ واں بدعنوان ترین ملک قرار دیا گیا ہے جبکہ گذشتہ سال اسے دنیا کے بدعنوان ترین ممالک میں ۴۲ ویں نمبر میں شامل کیا گیا تھا۔ اسی طرح دی نیشنل کرپشن پرسیپشن سروے (The National Corruption Perception Survey) کی رپورٹ 2009 عیسوی کے مطابق گذشتہ تین سالوں میں پاکستان میں جرائم اور بدعنوانی کی شرح میں ۴۰۰ گنا تک اضافہ ہوا ہے اور یہ بدعنوانی نچلی سطح سے لے کر اوپر تک زندگی کے ہر شعبے میں ناسور کی طرح پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں حال تو یہ ہے کہ جسے موقع مل رہا ہے وہ بدعنوانی میں مبتلا ہو کر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے کسی کو ملک و ملت کی فکر نہیں۔ سوائے اُن لوگوں کے جنہیں اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر ہے اور ملک و ملت سے حقیقی محبت ہے۔ رپورٹ کے مطابق بدعنوانی پولیس اور توانائی (جس میں بجلی، گیس اور پیٹرول وغیرہ شامل ہیں) میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ حدود و تعزیرات کا عدم نفاذ اور قانون کی عدم بالادستی اس کی وجہ ہے۔ لہذا حقیقت تو یہ ہے آج بھی معاشرتی

بگاڑ اور بدامنی کا خاتمہ عدل وانصاف پر مبنی قانون اور حدود وتعزیرات کے منصفانہ اور شفاف نفاذ سے ہی ممکن ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی (Rule of Law) نہیں بلکہ حکمرانوں کا قانون (Law of Ruler) ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ جرم وسزا کے حوالے سے اسلام کا ایک بنیادی قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جرم کو ظاہر ہونے سے پہلے حتی الوسع ختم کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس کے ظاہر ہونے سے دوسرے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور جرائم کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اگر کسی پر فرد جرم عائد کردیا جائے، تو پھر شریعت کا منشاء یہ ہے کہ مجرم کو ہر حال میں سزا دی جائے کیونکہ جرم کے ثبوت کے بعد اگر مجرم کے ساتھ کسی قسم کی رورعایت برتی گئی یا اُسے سزا نہ دی گئی تو پھر دوسرے لوگ بھی جرم کو ہلکا سمجھ کر کرینگے، جو معاشرتی بگاڑ کا باعث بنے گا۔ اس اُصول کے تناظر میں اگر گذشتہ چھ ماہ کا ریکارڈ جمع کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ میڈیا پر جرائم کے ایسے کئی واقعات منظر پر لائے گئے اور ان کی خوب پرچار بھی کی گئی مثلاً سانحہ سیالکوٹ، کراچی میں روزانہ ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کے واقعات اور اسی طرح کے دوسرے جرائم پر مبنی واقعات۔ لیکن میڈیا پر صرف جرم کو دکھایا جارہا ہے اس کی سزا نہیں لہذا یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ جرائم کی سزا میں روزافزوں اضافہ تو ہورہا ہے لیکن کمی نہیں۔ جرم وسزا کی تشہیر کے حوالے سے یہ عدمِ توازن لٹیروں اور قاتلوں کی حوصلہ افزائی کا باعث بن رہا ہے۔ اس پر سیاست دان، میڈیا کے ذمہ داران، علماءِ کرام اور معاشرے کے دوسرے بااختیار افراد کو غور کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

ان شاء اللہ

(یہ کلمہ کہنے کی اہمیت وافادیت اور نہ کہنے کا نقصان اور خسارہ)

ازقلم: صوبیدار میجر (ر) محمد افضل منیر (ایم۔اے)☆

معنی اور مفہوم:

''ان شاء اللہ'' یہ ایک عربی کلمہ ہے جس کے معنی اور مفہوم سے اکثر لوگ نا آشنا ہیں۔ حالانکہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں اپنی گفتگو کے دوران اسکا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں کی زبان سے تو یہ کلمہ بلا نیت وارادہ پھسل جاتا ہے۔ لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ بلکہ صدق دل سے اور خالص نیت وارادے سے اسکا استعمال ضروری ہے۔

''ان شاء اللہ'' کا معنی ہے ''اگر اللہ نے چاہا'' (تو میں یہ کام کروں گا) گویا یہ کلمہ بول کر انسان اپنے کام میں اللہ تعالیٰ کی مشیت، رضامندی اور خوشنودی شامل کر لیتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کی درخواست کرتا ہے اور اپنی تمام تر توانائیوں اور کوششوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ جب بندہ یہ کلمہ کہہ لیتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید اسکے شامل حال ہو جاتی ہے، اور وہ کام خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور نظر عنایت سے سہل وآسان ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اس کلمہ کے استعمال کو ترک کر دیتا ہے اور اپنے عزم وارادہ کی پختگی پر ناز وگھمنڈ کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ جرأت وبہادری سے اس کام پر مکمل دسترس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے بسا اوقات شدید ناکامی کے باعث سخت ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات یہی ہیں کہ جب انسان مستقبل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ

☆0321-5108424

یا وعدہ کرے تو صدقِ نیت اور خلوصِ دل سے ''ان شاء اللہ'' کہے تا کہ مشیت خداوندی اور تائید ایزدی اس کی حامی و ناصر بن جائے۔

''ان شاء اللہ'' کہنے میں ایک یہ راز بھی مضمر ہے کہ انسان اپنے پروردگار کے سامنے نہایت عجز و انکسار کا اظہار کرتا ہے۔ اپنی کم مائگی اور بے سروسامانی کا اعلان کرتے ہوئے اپنے رب کریم کے دامن لطف و رحمت سے وابستہ ہونے کا عندیہ دیتا ہے، نیز اپنی تہی دامنی اور تنگ دامانی کے باعث اپنے رحمان و رحیم اور قادر و کریم پروردگار سے توفیق و قدرت کا ملتجی ہوتا ہے۔ گویا اپنے رب قدیر سے التماس کرتا ہے کہ اے میرے خالق و مالک سب طاقتیں اور قدرتیں، سب قوتیں اور شوکتیں تیرے قبضہ قدرت میں ہیں۔ میں ایک بے بس اور بے کس ادنیٰ سا انسان ضعیف النسیان نہایت عاجز اور ناتواں ہوں۔ تیری توفیق اور مدد شامل حال ہوئی تو میرے سامنے پہاڑ بھی رائی کی مانند ہے لیکن اس کے برعکس اگر تیری توفیق میری رفیق کار نہ بنی تو میرے لیے رائی بھی پہاڑ ہے۔

موقع و محل:

''ان شاء اللہ'' کہاں اور کب کہنا چاہیے لہذا اس کے موقع و محل کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض احباب کم علمی اور نا سمجھی کی وجہ سے بے موقع اور بے محل اسکے مفہوم و معنی کے برعکس یہ کلمہ استعمال کر جاتے ہیں اور اس طرح وہ یا اسکی افادیت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا پھر بعض اوقات ان کے گنہگار ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اجتناب از حد ضروری ہے۔

یہ کلمہ ''ان شاء اللہ'' کہنے کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل اُمور کو ذہن میں رکھا جائے۔

۱۔ ایسا کام جس کے کرنے کا ارادہ ہو، اسکا تعلق زمانہ مستقبل سے ہو۔ یعنی یوں کہہ سکتا ہے کہ میں ''ان شاء اللہ'' مسجد بنواؤں گا، یا ''ان شاء اللہ'' مکان خریدوں گا۔ وغیرہ

۲۔ اس کام کا تعلق امر خیر سے ہو۔ یعنی اس میں نیکی اور بھلائی کا عنصر ہو۔ خواہ اپنی ذات کیلیے ہو یا اور لوگ بھی اس میں شریک ہوں۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ لہذا کوئی ایسا معاملہ جس میں اللہ

تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہو تو ایسے موقع پر ''ان شاء اللہ'' کہنا سخت ترین گناہ ہے کیونکہ وہ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف کر رہا ہے۔ مثلاً معاذ اللہ کوئی شخص یوں کہے میں ''ان شاء اللہ'' چوری کروں گا یا شراب پیوں گا تو ایسا کہنا انتہائی غلط ہے۔ عین ممکن ہے کہ عملاً ایسا کہنے والا دائرہ کفر میں داخل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایسی بات کہنے سے محفوظ فرمائے۔

۳۔ ایسا امر خیر ہو جس کے بارے میں مشیت الٰہی پہلے سے معلوم نہ ہو۔ لہٰذا جس امر خیر کے لیے حکم الٰہی موجود ہے تو اس کے لیے بھی ''ان شاء اللہ'' کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ہی مشیت الٰہی ہے۔ مثلاً کسی آدمی کو آپ نماز، روزہ وغیرہ احکام الٰہیہ کی تلقین کرتے ہیں تو وہ آدمی اس کے جواب میں یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ''ان شاء اللہ'' نماز پڑھوں گا۔ کیونکہ نماز کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کا حکم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ تم نماز ادا کرو۔ تم پر کوئی الگ سے وحی تو نازل نہیں ہوگی۔

ایسے آدمی کو چاہیے کہ اپنی سستی کوتاہی اور بے عملی کا اقرار کرے اور شیطانی مکر و فریب سے بچنے کیلیے اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق کا طالب ہو کر پابندی سے نماز ادا کرنے پر کمر بستہ ہو جائے۔

۴۔ اگر آدمی کسی ایسے امر خیر کے بارے میں بات کر رہا ہو جس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو تو پھر بھی وہ ''ان شاء اللہ'' نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ''ان شاء اللہ'' مسجد بنوائی تھی۔ بلکہ ایسی صورت میں الحمد للہ کے ساتھ بات شروع کرنی چاہیے۔ مثلاً یوں کہے میں نے الحمد للہ مسجد بنوائی تھی۔ قرآن کریم میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حصول سعادت کیلیے ایک مثال ذکر کر رہا ہوں۔

جنتی لوگ جنت میں جائیں گے وہاں کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھیں گے اور دوزخیوں کے احوال سے مطلع ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجا لاتے ہوئے کہیں گے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا''۔ (پ ۸، اعراف: ۴۳)

یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے اس کی راہ دکھائی۔

ہدایت چونکہ مل چکی ہے اور اسکا تعلق زمانہ ماضی سے ہے اس لیے اہل جنت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو گئے اور اس ہدایت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اصول بھی یہی ہے کہ ماضی میں واقع

ہونے والے ہر امر خیر کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے کہ اسی کی توفیق وتائید سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اس میں میری کوئی بہادری اور کمال نہیں۔ اگر کوئی شخص نادانی یا کم علمی کے باعث اسے اپنی بہادری اور کمال کا مظہر قرار دے تو قوی اندیشہ ہے کہ وہ اپنے اس عمل کے ثواب سے محروم ہو جائے۔

لہٰذا اپنے ہر نیک عمل کے بارے میں یوں کہے کہ میں یہ عمل (کام) اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رحمت سے ہی کر سکا۔ جس طرح کہ جناب ذوالقرنین نے دیوار بنانے کے بعد فرمایا!

''هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ''۔ (پ ۱۶۔ الکهف: ۹۸)

یہ دیوار کی تعمیر میرے رب کی رحمت کی وجہ سے ہوئی ہے۔

اور سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف بن برخیا نے جب پلک جھپکنے کی دیر میں تخت بلقیس حاضر کر دیا تو آپ نے فرمایا:

''هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ''۔ (پ ۱۹: النمل: ۴۰)

یہ۔۔۔ تخت بلقیس کا قلیل ترین وقت میں یہاں پہنچنا۔۔۔ میرے رب کے فضل سے ہوا ہے۔

ہاں! اگر آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا تو قطعاً قطعاً اللہ تعالیٰ کی طرف اسے منسوب نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا مشرکین کی عادت تھی۔ قرآن کریم میں مشرکین کا یہ شیوہ مذکور ہے کہ وہ اپنے اعمال شرکیہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے!

''سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا'' (پ ۸: الانعام: ۱۴۸)

عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے۔

ان کا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم نے جو کچھ کیا یا ہمارے آباؤ اجداد نے جو کچھ کیا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا۔ گویا یہ دلیل ہے کہ وہ اس سے راضی ہے۔ (استغفر اللہ)

بلکہ ایسی باتوں کو اپنے نفس کی شامت اعمال سمجھنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں ہے! وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (پ ۵ النساء: ۷۹)

یعنی جو تمہیں برائی پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔

۵۔ اور اگر اس امر خیر کا تعلق زمانہ حال سے ہو تو پھر یوں کہنا چاہیے۔ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ جیسا کہ قرآن کریم میں سورہ کہف کی آیات ۳۲ تا ۴۴ میں ایک مسلمان اور کافر کے درمیان ایک مکالمہ درج ہے۔ اس مکالمہ کی کیفیت یوں بیان کی گئی کہ ایک کافر اپنے باغ کی زرخیزی اور اس کے سر سبز و شاداب ہونے پر فخر و غرور کرتا ہے۔ اور اپنے مالدار اور طاقتور ہونے پر ناز اور گھمنڈ کرتا ہے۔ تو مسلمان اسے وعظ و نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

''وَلَوْ لَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ''۔ (پ ۱۵، الکہف: ۳۹)

ترجمہ از کنز الایمان: کیوں نہ ہوا کہ جب تو اپنے باغ میں گیا، تو کہا ہوتا، جو اللہ چاہے، ہمیں کچھ زور نہیں مگر اللہ کی مدد کا۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت صدر الافاضل مراد آبادی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں!

''اگر تو باغ کو دیکھ کر۔ ماشاء اللہ۔ کہتا اور اعتراف کرتا کہ یہ باغ اور اس کے تمام محاصل و منافع اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے فضل و کرم سے ہیں اور سب کچھ اسکے اختیار میں ہے۔ چاہے اسکو آباد رکھے، چاہے ویران کرے۔ ایسا کہتا تو تیرے حق میں بہتر ہوتا۔ تو نے ایسا کیوں نہیں کیا؟'' (تفسیر خزائن العرفان)

مگر اس کافر نے مسلمان کی نصیحت کو قبول نہ کیا بلکہ نخوت و اعونت سے اس کی گردن اکڑی رہی۔ اور تقریباً اکثر مالداروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کو اپنے علم و ہنر کا کمال اور اپنی ذات کا استحقاق سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ قارون نے اپنے مال و دولت کے بارے میں کہا کہ:

''اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ''۔ (پ ۲۰، القصص: ۷۸) یہ مال و دولت تو مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ جو کہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ ہر چیز پر قادر ہے اس نے اسکے تمام اموال و اسباب سمیت اسے زمین میں دھنسا کر اعلان کر دیا:

"فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ "۔(پ۲۰،القصص:۸۱) تو ہم نے اسے (یعنی قارون کو) اور اسکے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔

تو یہی حال اور انجام اس کافر کا بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے انجام بد کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

"وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ○(پ۱۵،الکہف:۴۲) اور اس کے پھل گھیر لیے گئے تو وہ اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اس لاگت پر جو اس نے باغ پر خرچ کی تھی اور وہ (باغ) اوندھے بل گرا ہوا تھا۔ اور کافر کہہ رہا تھا، اے کاش! میں نے اپنے رب کا کسی کو شریک نہ کیا ہوتا۔

مگر اب پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

یہ تو بندے پہلے سوچنا چاہیے کہ جو قادر مطلق دے سکتا ہے وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔

ان شاء اللہ کہنے کی اہمیت:

"ان شاء اللہ" کہنے کی اہمیت کے حوالے سے تین باتیں اپنے ذہن میں رکھیں اور پھر اندازہ فرمالیں کہ اس کلمہ کی کتنی بڑی اہمیت ہے جس سے ہم عموماً صرف نظر کیے رکھتے ہیں۔ پہلے یہ تین پوائنٹ نوٹ فرمالیں پھر حسب مقدور ان کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱) اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا۔

۲) اللہ تعالیٰ نے خود بھی اس کلمہ کو استعمال فرمایا۔

۳) انبیائے کرام نے بھی اس کلمہ کو استعمال کرنے کا التزام رکھا۔

اب ان تینوں کی مختصری توضیح پیش خدمت ہے۔

۱۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الف)۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ (پ۱۵،الکہف:۲۳) کسی شیء کے بارے میں (حتمی طور پر) ہرگز یہ نہ کہو کہ میں کل یہ (ضرور) کروں گا، مگر یہ کہ جب اللہ چاہے) یعنی یوں کہو جب اللہ چاہے گا تو یہ کام کروں گا۔

حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی جب کام کا ارادہ ہو تو یہ کہنا کہ ''ان شاء اللہ'' ایسا کروں گا۔ بغیر ''ان شاء اللہ'' کے نہ کہے''۔ (خزائن العرفان)

اس آیت مبارکہ کے شان نزول کے بارے میں آپ رقم طراز ہیں:

''اہل مکہ نے رسول کریم ﷺ سے اصحاب کہف کا حال دریافت کیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا! کل بتاؤں گا۔ اور ''ان شاء اللہ'' نہیں فرمایا تھا کئی روز وحی نہیں آئی۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی''۔ (خزائن العرفان)

اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ اس آیت مبارکہ میں تاکید کس قدر ہے۔ ایک تو فعل نہی ہے اور دوسرا اس پر نون تاکید ثقیلہ لگایا گیا ہے، جس کے باعث تاکید میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اسکا اندازہ اس ایت کے ترجمہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

(ب)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ ۔ (پ ۱۵، الکہف: ۲۴) اپنے رب کو یاد کرو جب تم بھول جاؤ۔

اسکا مفہوم یہ ہے کہ دوران کلام اگر ''ان شاء اللہ'' کہنا یاد نہیں رہا تو جب یاد آئے تو ''ان شاء اللہ'' کہہ لے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک اس مجلس میں رہے تو ''ان شاء اللہ'' کہہ سکتا ہے۔ (ماخوذ از خزائن العرفان)

۲۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود بھی اس کلمہ ''ان شاء اللہ'' کو استعمال فرمایا ہے۔ سورہ فتح میں مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری دی گئی اور شہر مکہ میں داخل ہونے کا یقین دلایا گیا۔ صلح حدیبیہ سے قبل سرکار دو عالم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی معیت میں مکہ معظمہ داخل ہوئے۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب سے بیان فرمایا تو صحابہ کرام نہایت خوش ہوئے اور یہ خیال کیا کہ وہ اسی سال اس خواب کی تعبیر دیکھ لیں گے، اور مکہ معظمہ میں بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوں گے۔ لیکن جب صلح حدیبیہ کی صورت میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے بغیر واپس آنا پڑا تو منافقوں نے استہزا کرتے

شروع کر دیا۔ جس سے صحابہ کرام سخت دل گرفتہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

"لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ"۔۔۔۔الآیۃ۔ (پ ۲۶، الفتح: ۲۷)

بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کا سچا خواب (اے مسلمانو!) بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے اگر اللہ چاہے، امن وامان سے۔ (ترجمہ از کنزالایمان)

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پختہ اور مؤکد بیان کرتے ہوئے کلمہ "ان شاء اللہ" کے ساتھ ذکر فرمایا اور اپنی مشیت کی مہر ثبت فرما دی۔

۳۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا طرز عمل بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان مبارک ہستیوں نے دوران کلام اسی کلمہ "ان شاء اللہ" کو لازمی استعمال فرمایا۔ ذیل میں قرآن کریم سے ہی ماخوذ انبیائے کرام کے اقوال پیش خدمت ہیں۔

(ا)۔ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر کے فرمانروا بنے اور تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے تو اپنے والدین کریمین کو اپنے بھائیوں کو ان کی آل اولاد سمیت مصر میں سکونت اختیار کرنے کے لیے بلایا۔ جب وہ مصر کے قریب پہنچے تو آپ خود ان کے استقبال کیلیے مصر سے باہر نکلے اور انہیں مصر میں داخل ہو کر سکونت اختیار کرنے کے بارے میں یوں کہا:

"وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ"۔ (پ ۱۳، یوسف: ۹۹) اور حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کہا، ان شاء اللہ مصر میں امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

یعنی آپ لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کی اجنبیت کا اندیشہ، وطن سے دوری کی فکر، اور بے گانگی کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہاں آپ کو امن وسکون اور سلامتی حاصل ہوگی اور اپنے وطن جیسا آرام واطمینان ملے گا۔

(ب)۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے سامنے اپنے خواب کا ذکر فرمایا کہ اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کو ذبح کر رہا ہوں اور

نبی کا خواب چونکہ حکم الٰہی ہوتا ہے۔اس لیے اب تم بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے۔تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنے عظیم باپ کے سامنے فدویانہ انداز میں گزارش کی:

''قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ''۔(پ۲۳،الصافات ۱۰۲:)

اے پیارے ابا جان! جس بات کا آپ کو حکم ہوا ہے آپ اس کی تعمیل کیجئے۔ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنے حلقوم ناز پر چھری چلنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اسے اپنے لیے ایک عادت خیال فرمایا۔لیکن اس مشکل ترین کام میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا سہارا لیا۔اس کام کے مشکل ہونے کا ذکر خود رب کائنات نے فرمایا:

''إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ''۔(پ۲۳،الصافات:۱۰۶) بے شک یہ ایک بہت بڑی (مشکل) آزمائش تھی۔

یہ مشکل جہاں بیٹے کے لیے تھی،وہاں باپ کیلئے بھی شاید اس سے زیادہ مشکل تھی،کیونکہ جس باپ کو بڑھاپے کی عمر میں اسماعیل علیہ السلام جیسا ہونہار اور فرمانبردار فرزند نصیب ہوا ہو،جو اسکے بڑھاپے کا سہارا بننے والا ہو،اسکے ریشمیں حلقوم پہ چھری رکھنا بڑے ہی دل گردے کا کام تھا۔لیکن جب باپ بیٹے دونوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا مندی کو اپنا نصب العین بنالیا،تو یہ اتنی بھاری مشکل آسان ہوگئی اور پھر وفدیناہ بذبح عظیم کہہ کر رب کریم نے اپنے عظیم انعامات اور مژدہ قبولیت سے سرفراز فرمادیا۔

(ج)۔حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کو چھوڑ کر مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے۔راستے میں میں ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔آپ نے وہاں دو نیک سیرت خواتین دیکھیں جو ایک جانب اپنے جانوروں کو سنبھال رہی تھیں۔آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا مسئلہ ہے۔وہ کہنے لگیں کہ جب یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے جائیں گے تو باقی بچا

کہا پانی ہم اپنے جانوروں کو پلا لیتی ہیں، کیونکہ یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد کنویں کو ایک بھاری پتھر سے ڈھانک جاتے ہیں جسے اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔

وہ بھاری پتھر جسے دس آدمی بمشکل اٹھاتے اور رکھتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تن تنہا وہ پتھر اٹھایا، کنویں سے پانی نکال کر ان خواتین کے جانوروں کو خوب سیراب کرنے کے بعد ایک کنارے آرام کی غرض سے نکل گئے۔

وہ دونوں نیک نہاد خواتین حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں تھیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آج تم جانوروں کو پانی پلا کر جلدی واپس آ گئی ہو۔ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتایا کہ اس طرح ایک نیک طینت فرشتہ صورت انسان نے ہماری مدد کی، اس وجہ سے آج ہم جلدی گھر لوٹ آئی ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام فراست نبوت سے سارا معاملہ سمجھ گئے اور اپنی ایک صاحبزادی کو فرمایا کہ جاؤ اور اس نووارد کو بلا کر لے آؤ۔

حضرت شعیب علیہ السلام اس وقت ضعیف العمر تھے۔ اولاد صرف دو بیٹیوں پر مشتمل تھی۔ اس لیے آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میرے پاس آٹھ یا دس سال تک قیام فرمائیں۔ تو اس کے بدلے میں اپنی ایک صاحبزادی کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں گا۔ تو اس گفتگو میں آپ نے فرمایا:

"سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ O (پ۲۰، القصص:۲۷) ان شاء اللہ تم مجھے نیک لوگوں میں پاؤ گے۔

(د)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم لدنی (علم مکاشفہ) تھا، تو آپ نے حضرت خضر سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرصہ آپ کے ساتھ رہ کر اس علم کے بارے میں معلومات حاصل کر لوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے علم مکاشفہ کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عجیب و غریب واقعات دیکھیں گے تو خاموش نہیں رہ سکیں گے، چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جب ان سے اس بات کا برملا اظہار کر دیا تو جواباً حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے خاموش رہنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا O (پ ۱۵، الکہف: ۶۹) فرمایا! ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

اس سے یہ بات مستفاد ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان واقعات کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے جو بے تابی کا مظاہرہ فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عین مطابق تھا۔

ان شاء اللہ کہنے کی افادیت:

اس تحریر کے آغاز میں عرض کر دیا ہے کہ ان شاء اللہ کہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہو جاتی ہے۔ ذیل میں اس موقف کی وضاحت قرآن و حدیث کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

۱)۔ قرآن کریم میں سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے حوالے سے ایک گائے کا ذکر ہے۔ اسکا مختصر پس منظر یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک مالدار شخص تھا، اسکے چچازاد بھائی نے بطمع وراثت اسکو قتل کر کے کسی دوسری بستی کے دروازے پر ڈال دیا اور خود صبح اس کے خون کا مدعی بن گیا۔ لوگوں نے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ حقیقت حال ظاہر فرمائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کریں اور اس کے گوشت کا کوئی حصہ مقتول کے جسم کے ساتھ لگائیں تو مقتول زندہ ہو کر بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔

بنی اسرائیل اس حکم کی تعمیل میں لیت و لعل کرنے لگے اور گائے کے بارے میں طرح طرح کے سوال و جواب کرنے لگے۔ انکا مقصد یہ تھا کہ گائے ذبح کرنے کا حکم ٹل جائے۔ کج بحثی میں اس قدر بڑھ گئے کہ ہر سوال میں استہزا کی جھلک نظر آتی ہے اور اپنے رسول معظم کی گستاخی اور بے ادبی کا پہلو نمایاں ہو رہا ہے جس میں نافرمانی اور عدم تعمیل کا عنصر غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سوال کے جواب میں سے مزید کوئی نہ کوئی سوال گھڑ لیتے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل کج بحثی میں نہ الجھتے اور کوئی سی گائے بھی ذبح کر

دیتے تو حکم الٰہی پر عمل ہو جاتا لیکن بمصداق۔۔۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔۔۔ جوں جوں ان کا سلسلہ سوال دراز ہوتا گیا، گائے ذبح کرنے کا معاملہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا، لیکن حکم ربی چونکہ اٹل تھا اس لیے جب بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ گائے ذبح کرنا ناگزیر ہے جس سے چھٹکارا ناممکن ہے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں نیازمندی کے ساتھ درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے اس مطلوبہ گائے کے مکمل اوصاف اور خصائص دریافت کریں اور آخر میں کہا:

"وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ (پ ا، البقرہ: ۷۰) اور ہم ان شاء اللہ یقیناً راہ یاب ہو جائیں گے۔

جب انھوں نے یہ کلمہ ان شاء اللہ استعمال کیا تو انہیں حکم الٰہی کی بجا آوری کی توفیق نصیب ہوگئی۔ حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ ان شاء اللہ کا کلمہ استعمال نہ کرتے تو وہ کبھی بھی مطلوبہ گائے تک رسائی اور رہنمائی نہ حاصل کر پاتے۔ (ماخوذ از خزائن العرفان، ضیاالقرآن)

۲)۔ سورہ کہف کی آیات ۹۳ تا ۹۸ کا مطالعہ فرمائیں انکا ماحصل یہ ہے کہ جناب ذوالقرنین اپنی فتوحات کے سلسلہ میں ایک قوم کے پاس گئے اس قوم نے اپنی ایک تکلیف اور مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یاجوج ماجوج کی قوم نے ہمارے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہم ان کی اذیت اور ایذا رسانی سے بہت پریشان ہیں۔ انکی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ ٹڈی دل کی طرح نکلتے ہیں اور ہر طرف پھیل جاتے ہیں۔ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، کھیتیاں ویران کر دیتے ہیں اور خشک ساز وسامان لاد کر لے جاتے ہیں۔ انسانوں سمیت، درندوں، وحشی جانوروں حتیٰ کہ سانپوں اور بچھوؤں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ لہذا ہمارے ساتھ اگر آپ کوئی بھلائی کر سکتے ہیں تو ان کے شر سے ہمیں بچائیں، اور ان کے شر اور فساد سے بچنے کیلیے بہترین صورت یہ ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط فصیل (دیوار) بنادیں۔

چنانچہ حضرت ذوالقرنین علیہ السلام نے ان کی تجویز کو قبول کیا اور لوہے اور تانبے وغیرہ کو پگھلا کر ایک نہایت مضبوط دیوار کھڑی کر دی جس کے باعث اس قوم کو یاجوج ماجوج کی ایذا رسانیوں سے نجات حاصل ہوگئی اور انہیں سکون واطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ جب وہ قوم آپ کے سامنے تشکر

واحسان کا اظہار کرنے لگی تو آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

''قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا O (پ۱۶، الکہف:۹۸)

کہا یہ میرے رب کی رحمت (سے ممکن ہوا) ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اسے پاش پاش کر دے گا۔ اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جناب ذوالقرنین نے اس عظیم کارنامے کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اسے اپنے رب کی رحمت اور مہربانی سے تعبیر کیا۔ (یہ اشارہ پہلے گذر چکا ہے) نیز آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ دیوار اگرچہ بہت مضبوط ہے لیکن اسکے باوجود ایک نہ ایک دن اس نے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانا ہے اور یہ کب ہونا ہے اسکے بارے میں حدیث شریف سے ہمیں یوں رہنمائی ملتی ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ!

یاجوج ماجوج روزانہ اس دیوار کو توڑتے ہیں اور دن بھر محنت کرتے ہیں جب اس کو توڑنے کے قریب ہو جاتے ہیں تو ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ چلو باقی کل توڑ لیں گے، دوسرے روز آتے ہیں تو بحکم الٰہی وہ دیوار پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ قیامت کے قریب جب ان کے خروج کا وقت آئے گا (اللہ تعالیٰ کے وعدے اور مشیت کے مطابق) تو ان میں سے کوئی کہنے والا یوں کہے گا کہ اب چلو ان شاء اللہ باقی کل توڑ لیں گے۔۔۔تو۔۔۔اب۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنے کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس دن کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور اگلے دن انہیں اتنی دیوار ٹوٹی ہوئی ملے گی جتنی کہ وہ پہلے دن توڑ گئے تھے۔ آمدم برسر مطلب۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنے سے بندے کی محنت اکارت نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید حاصل ہو جاتی ہے۔ لہذا ہم پر لازم ہے کہ ان شاء اللہ کہنے کا التزام رکھیں۔

ان شاء اللہ نہ کہنے کا نقصان:

جس طرح ان شاء اللہ کہنے سے فوائد حاصل ہوتے ہیں اسی طرح ان شاء اللہ نہ کہنے سے نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قرآن کریم سے ماخوذ ایک واقعہ کا مطالعہ فرمائیں جو

ہمارے اس بیان کی واضح دلیل ہے۔

ا۔ پارہ ۲۹ سورہ القلم میں آیات ۱۷ تا ۲۰ کو غور سے پڑھیں ان آیات میں ایک واقعہ کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ:

یمن سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر مقام صنعا میں سر راہ ایک باغ تھا جس کا نام ضروان تھا۔ اسکا مالک ایک مرد صالح تھا جو باغ کے میوے کثرت سے فقراء کو دیتا تھا۔ جب باغ میں جاتا تو فقراء کو بلا لیتا۔ تمام گرے پڑے فقراء لی لیتے اور باغ میں بستر بچھا دیے جاتے اور جو خالص اپنا حصہ ہوتا اس میں سے بھی دسواں حصہ فقراء کو دے دیتا۔ اسی طرح کھیتی کاٹتے وقت بھی اس نے فقراء کے بہت زیادہ حقوق مقرر کر رکھے تھے۔ اس کے تین بیٹے تھے (جب اسکا انتقال ہو گیا) تو اس کے بیٹے اس کے وارث ہوئے۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ مال قلیل ہے اور کنبہ بہت ہے۔ اگر والد کی طرح ہم بھی خیرات جاری رکھیں گے تو تنگدست ہو جائیں گے۔ انہوں نے آپس میں مل کر قسمیں کھائیں کہ کل صبح سویرے منہ اندھیرے گھر سے نکل چلیں گے اور لوگوں کے اٹھنے سے پہلے اپنی فصل اور میوے سنبھال لیں گے۔ کیونکہ فقراء اور مساکین مانگ مانگ کر تنگ کر دیتے ہیں۔ منہ اندھیرے نہ کوئی فقیر آئے گا نہ مانگے گا۔ اس مشاورت میں انہوں نے قسمیں کھا کر اپنے عزم مصمم کا اظہار کیا۔ مگر ان شاء اللہ نہ کہا۔ قرآن میں ان کا تذکرہ یوں کیا گیا:

"اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ (پ ۲۹، القلم: ۱۷، ۱۸)

جب انہوں نے قسم کھائی کہ ضرور صبح ہوتے اسکے کھیت کاٹ لیں گے۔ اور ان شاء اللہ نہ کہا۔

تو ان شاء اللہ نہ کہنے کا کیا نقصان ہوا۔ ذرا اگلی آیات ملاحظہ فرمائیں:

"فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝

تو اس باغ پر تمہارے رب کی طرف سے ایک آفت آئی جبکہ وہ ابھی سوئے تھے۔ تو وہ باغ صبح تک ویرانی اور بربادی کا منظر پیش کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی کہاں بھاگ سکتا ہے اسکی خفیہ تدبیر بہت سخت ہوتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ

ہمیں اپنے ہر کام اور ارادے میں ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔ کہنا نہیں بھولنا چاہیے تاکہ اپنے معاملات کے فوائد سے متمتع ہوسکیں اور ان کے نقصانات سے محفوظ رہ سکیں۔

گذشتہ سطور میں جو معروضات پیش کی گئی ہیں ان کی تہہ میں مستور یہ حقیقت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔ نہ کہنے سے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہیں ہوتی اور انسان اپنے مقاصد کے حصول میں عموماً خاطر خواہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتا۔

۳)۔آپ نے پڑھا کہ بنی اسرائیل گائے کے ذبح کرنے کے معاملے میں موشگافیاں نکالتے رہے اور جب تک انہوں نے ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔ نہیں کہا تو انکا معاملہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا، جس سے بخوبی اور بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔ نہ کہنے سے مسائل میں دشواری اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔

۴)۔یاجوج ماجوج کے بارے میں بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ لوگ جناب ذوالقرنین کی بنائی ہوئی مضبوط ترین دیوار کو توڑنے میں مصروف ہیں۔اور اب تک انہیں صدیاں بیت گئی ہیں مگر انہیں کاطرخواہ کامیابی حاصل نہیں ہورہی ہے۔کیونکہ وہ ان شاء اللہ نہیں کہتے البتہ جب وہ ان شاء اللہ کہیں گے تو دیوار توڑنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

حاصل کلام:

اس ساری عرضداشت کا نتیجہ اور خلاصہ یہ کہ!

۱۔ ان شاء اللہ کہنا اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی اپنے کلام میں ان شاء اللہ استعمال فرمایا۔

۳۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ جب اپنے کسی ارادے کا اظہار فرماتے تو ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔ کا کلمہ ضرور استعمال فرماتے۔

۴۔ جب کسی کام کیلیے ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔ کا کلمہ استعمال کیا جائے تو اس کے مثبت اثرات اور بابرکت ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔ ’’ان شاء اللہ‘‘ کا استعمال ترک کرنے سے معاملات میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات ناقابل تلافی نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اپنے معاملات میں اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے کسی نیک کام کے کرنے کا ارادہ ظاہر کریں تو۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔اس میں ضرور استعمال کریں۔ یا کسی سے کوئی وعدہ یا معاہدہ کریں تو۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنا ہرگز نہ بھولیں۔ اور اگر بالفرض اس وقت یاد نہیں رہا تو جب یاد آئے تو فوراً۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہہ لیں۔ اس عمل سے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو جائے گی اور وہ کام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوگا۔

میرے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے کے لوگ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کام کرنے کے ارادے سے کہتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں کسی کام کو ٹرخانے کیلیے یا ٹال مٹول کرنے کے لیے۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہہ لیتے ہیں اور دن بدن لوگوں کی یہ روش بڑھتی جا رہی ہے۔

قارئین کرام سے میری دست بستہ گذارش ہے کہ ٹالنے کی غرض سے کبھی بھی۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کا کلمہ استعمال نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کرنے سے آپ کسی ایسے وبال یا مصیبت میں گرفتار ہو جائیں جس سے گلو خلاصی ناممکن ہو جائے اور پچھتاوا حاصل ہو۔ اس لیے جب یہ کلمہ استعمال کریں تو صدق دل سے کام کرنے کی نیت سے۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

تحقیق تاریخ
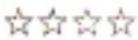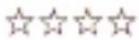
ولادت ووصال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم

تحریر: ابو اُسامہ ظفر القادری بکھروی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین اما بعد

حضورﷺ کی تاریخ ولادت کا بیان:

شاعر دربار رسالت حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا فرمائی۔ ساٹھ سال آپ نے جہالت میں گزارے اور ساٹھ سال بحیثیت ایک سچے مومن کے آپ کو زندگی گزارنے کی مہلت دی گئی۔ آپ فرماتے ہیں! ''میری عمر ابھی سات آٹھ سال تھی مجھ میں اتنی سمجھ بوجھ تھی کہ جو میں دیکھتا اور سنتا تھا وہ مجھے یاد رہتا تھا۔ ایک دن علی الصبح ایک اونچے ٹیلے پر یثرب میں ایک یہودی کو میں نے چیختے چلاتے ہوئے دیکھا وہ یہ اعلان کر رہا تھا: ''یا معشر یھود فاجتمعوا الیہ۔ اے گروہ یہود سب میرے پاس اکٹھے ہو جاؤ۔ یہودی اسکا اعلان سنتے ہی بھاگ کر اس کے پاس اکٹھے ہو گئے اور اس سے پوچھا بتاؤ کیا بات ہے۔ اس نے کہا! ''طلع نجم احمد الذی ولد بہ فی ھذہ اللیلۃ ای الذی طلوعہ علامۃ علی ولادتہ ﷺ فی تلک اللیلۃ فی بعض الکتب القدیمۃ''۔ اس نے کہا کہ وہ ستارہ طلوع ہو گیا جس نے اس شب کو طلوع ہونا تھا۔ جو بعض کتب قدیمہ کے مطابق احمد (ﷺ) کی ولادت کی رات ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۳۰، ۳۱)

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کا یوم میلاد دوشنبہ یعنی سوموار کا دن تھا۔ اس پر بھی علماء اُمت کا تقریباً اتفاق ہے۔ وہ بابرکت مہینہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ہوئی ربیع الاول کا تھا۔ اب ہم دلائل کی روشنی میں دیکھیں گے کہ ربیع الاول کی تاریخ کون سی تھی؟

صحیح ترین تاریخ ولادت ۱۲ ربیع الاول ہی ہے:

۱۔امام ابن جریر طبری جو فقید المثال مفسر، بالغ نظر مورخ بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں!'' ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرة لیلةً مضت من شهر ربیع الاول ''۔رسول کریم ﷺ کی ولادت سوموار کے دن ربیع الاول شریف کی بارھویں تاریخ کو عام الفیل میں ہوئی۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۵)

۲۔علامہ ابن خلدون جو علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں امام تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں!'' ولد رسول الله ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرة لیلةً خلت من ربیع الاول لاربعین سنةً من ملک کسری انو شیروان ''۔رسول اللہ ﷺ کی ولادت عام الفیل کو ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی۔نوشیرواں کی حکومت کا چالیسواں سال تھا۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۱۰)

۳۔عالم اسلام کے سب سے پہلے مشہور سیرت نگار امام محمد بن اسحاق (علامہ ابن ہشام/متوفی ۲۱۳ ہجری) اپنی' سیرۃ النبوۃ میں رقم طراز ہیں!'' ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلةً خلت من شهر ربیع الاول عام الفیل ''۔رسول کریم ﷺ سوموار بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ (السیرۃ النبویہ ابن ہشام ج ا ص ۱۷۱)

۴۔علامہ ابوالحسن بن محمد الماوردی ارشاد فرماتے ہیں!'' لانه ولد بعد خمسین یوماً من الفیل وبعد موت ابیه فی یوم الاثنین الثانی عشرة من شهر ربیع الاول ''۔واقعہ اصحاب فیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد حضور ﷺ بروز سوموار بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ (اعلام النبوۃ ص ۱۹۲)

۱۲ ربیع الاول بروز سوموار کو ولادت رسول ﷺ قرار دینے والوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں:

۱)۔علامہ ابن جوزی: الوفا ابن جوزی ص ۹۰ (۲۔امام الحافظ ابو الفتح محمد بن محمد بن عبد اللہ شافعی: عیون الاثر ج ا ص ۲۶ (۳۔محمد رضا المصری، قاہرہ یونیورسٹی: محمد رسول اللہ ص ۱۹

۴)۔حافظ ابن کثیر: سیرت ابن کثیر ج ا ص ۱۹۹ (۵۔امام حاکم: المستدرک ج ۲ ص ۶۰۳

(۶۔ابن جوزی: بیان میلاد النبی ﷺ ص ۳۱ (۷۔شیخ محمد ابوزہرہ: خاتم النبیین ج ۱ ص ۱۱۵

۸۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی: ماثبت من السنۃ ص ۹۸ (۹۔علامہ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۶۰ (۱۰۔ملا علی قاری: المورد الروی ص ۹۶ (۱۱۔امام یوسف نبہانی: حجۃ اللہ علی العالمین ج ۱ ص ۲۳۱ (۱۲۔امام قسطلانی: مواہب اللدنیہ ص ۳۴ (۱۳۔نواب صدیق حسن خان بھوپالی (غیر مقلد): الشمامۃ العنبریہ ص ۷ (۱۴۔عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی: مختصر سیرت رسول (۱۵۔مفتی محمد شفیع دیوبندی: سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۸ (۱۶۔علامہ یوسف نبہانی: انوار محمدیہ ص ۱۸ (۱۷۔شیخ محمد الصبان: نور الابصار ص ۹ (۱۸۔محمد رستم قاسمی: سیرت پاک ص ۳۲ (۱۹۔محمد صادق سیالکوٹی (غیر مقلد): سید الکونین ص ۵۹ (۲۰۔علامہ نور بخش توکلی: سیرت الرسول عربی ص ۴۳ (۲۱۔عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی: تاریخ اسلام ص ۳۵ (۲۲۔ملا معین کاشفی: معارج النبوت ص ۸۰ (۲۳۔امام زرقانی: زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۳۲ (۲۴۔محمد صادق ابراہیم عرجون: محمد رسول اللہ ﷺ ج ۱ ص ۱۰۲ (۲۵۔پیر محمد کرم شاہ الازہری: ضیاء النبی ﷺ ج ۲ ص ۳۳

امام بخاری وامام مسلم علیہ الرضوان کے استاذ حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا کہ!

''عن عفان عن سعید بن میناء عن جابر و ابن عباس انھما ولا ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول ''۔حضرت جابر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عام الفیل سوموار کے دن ۱۲ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔(مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ ضیاء النبی ج ۲ ص ۳۷، سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹، بلوغ الامانی شرح فتح الربانی ج ۲ ص ۱۸۹ بیروت، البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۲۶۰ بیروت)

سند کا تعارف: پہلا راوی ابوبکر بن ابی شیبہ ہے۔ انکے متعلق امام ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ محدث ابن حبان کہتے ہیں کہ ابوبکر عظیم حافظ حدیث تھے۔ دوسرے راوی عفان ہیں۔ انکے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ عفان ایک بلند پایہ امام ثقہ، صاحب ضبط و اتقان ہیں۔ تیسرے راوی سعید بن مینا ہیں ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا

ہے۔ (خلاصۃ التہذیب ص ۱۴۳، تقریب ص ۱۲۶)

چوتھے راوی دو صحابہ کرام ہیں اور ان کے ثقہ ہونے پر اجماع اُمت ہے۔ لہذا ان دو صحابہ کرام سے جب صحیح سند کے ساتھ ولادت کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول بروز سوموار ثابت ہے تو پھر کسی ماہر فلکیات کا قول کیا معنی رکھتا ہے۔ اور علماء کی کثیر تعداد نے، مفسرین، سیرت نگاروں نے ۱۲ ربیع الاول ہی کو رسول اللہ ﷺ کی ولادت مانا ہے۔ دیوبندی حضرات کے لیے تو انکے علماء کی تحقیق ہی کافی ہے جو پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ غیر مقلدین حضرات کے لیے ان کے علماء کے اقوال کے ساتھ ساتھ صحیح سند کے ساتھ حدیث نقل کی جا چکی ہے۔ اگر یہ واقعی اہل حدیث ہیں تو یہ حدیث انکے لیے کافی ہونی چاہیے۔

جمہور علماء کا مسلک:

علاوہ ازیں جمہور علماء کا مسلک بھی یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول ہی ہے ملاحظہ فرمایئے: (السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۹۳، زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۳۲، الفتح الربانی ج ۲ ص ۱۸۹)

اہل مکہ و مدینہ کا معمول:

۱۲ ربیع الاول ہی کو حضور ﷺ کے مکان شریف پر حاضر ہو کر میلاد شریف کا قدیم اہل مکہ کا معمول رہا ہے۔ (زرقانی ج ۱ ص ۱۳۲، سیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۹۳، المورد الروی ص ۹۵، ماثبت من السنۃ ص ۹۸، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۴، تواریخ حبیب الٰہ وغیرہ)۔

اسی طرح ۱۲ ربیع الاول ہی کو اہل مدینہ اور دیگر شہروں کے مسلمانوں کا میلاد شریف منانے کا معمول رہا ہے ملاحظہ فرمایئے: (سیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۹۳، زرقانی علی المواہب ص ۱۳۲)

ان تمام حوالا جات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت مبارک ۱۲ ربیع الاول ہی ہے۔ غیر مقلدین اور علماء دیوبند کے اکابر بھی ۱۲ ربیع الاول کو ہی راجح قرار دیتے ہیں۔ غیر مقلدین کے پیشوا جناب نواب صدیق حسن خان بھوپالی کہتے ہیں: "ولادت شریف مکہ مکرمہ میں وقت طلوع فجر روز دوشنبہ دوازدھم ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی۔ جمہور علماء کا یہی قول

ہے۔ ابن جوزی نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے۔ (الشمامۃ العنبریہ من مولد خیر البریہ ص ۷)

علماء دیوبند کے عالم مفتی محمد شفیع (کراچی) اپنی کتاب سیرت خاتم الانبیاء میں فرماتے ہیں!

"اس پر اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت ماہ ربیع الاول میں دوشنبہ کے دن ہوئی لیکن تاریخ کے تعین میں چار اقوال مشہور ہیں: دوسری، آٹھویں، دسویں، بارھویں مشہور قول بارھویں تاریخ کا ہے۔ یہاں تک کہ ابن الجزاز نے اس پر اجماع نقل کر دیا اور اسی کو کامل ابن اثیر میں اختیار کیا گیا۔ (سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۰۱ بر حاشیہ)۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی بھی ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ کے متعلق فرماتے ہیں جمہور اہل علم میں یہ تاریخ مشہور ہے (سیرت سرور عالم ص ۹۳، ۹۴)

۱۲ ربیع الاول تاریخ ولادت پر محدثین کا اجماع: امام زرقانی، ابن کثیر، امام ابن جوزی، علامہ قسطلانی، علامہ جمال حسینی، ملا علی قاری، امام ابن سید الناس، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شیخ ابو زہرہ مصری، امام طیبی، علامہ ابن اثیر، علامہ طبری، علامہ جامی، امام بیہقی، ملا معین کاشفی مصری وغیرہم نے ۱۲ کے قول کو صحیح راجح اور معمول بہا کہا ہے اور قول پر اجماع و اتفاق نقل کیا ہے!" وهذا هو المشهور عند الجمهور ولا على الصحيح بمكة عند طلوع الفجر يوم الاثنين لاثنى عشر وهو الذى عليه العمل وبالغ ابن الجوزى وابن الجزاز فنقلا فيه الاجماع "۔ اور یہ جمہور کے مشہور اور صحیح تاریخ ولادت مکہ میں طلوع فجر کے وقت بروز سوموار ۱۲ ربیع الاول ہے اسی پر سب کا عمل ہے اور ابن جوزی و ابن الجزاز نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹، زرقانی شرح مواہب ج ۱ ص ۱۳۲، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۴، میلاد النبوی جوزی ص ۴۰، عیون الاثر ج ۱ ص ۲۷، معارج النبوت ج ۱ ص ۸۵، خاتم النبیین ص ۱۱۵، تاریخ طبری، دلائل النبوت بیہقی ج ۱ ص ۸۳، ماثبت من السنۃ ص ۹۸)

تاریخ وصال کی تحقیق: عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ہی کو حضور ﷺ کا وصال ہوا۔ اور دور حاضر میں بھی کچھ لوگ یہی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس ضمن میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے جو کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ

عنہ سے منسوب ہے کہ آپ ﷺ کا وصال ربیع الاول کو ہوا۔ (البدایہ والنہایہ:۲۵۶)

جواب: اس روایت سے متعلق یہ عرض ہے کہ اس کی سند میں محمد بن عمر الواقدی ایک راوی ہے جس کے متعلق امام اسحاق بن راہویہ، امام علی بن مدینی، امام ابو حاتم، امام نسائی نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ واقدی اپنی طرف سے حدیثیں گھڑ لیتا تھا۔ امام یحییٰ بن معین نے کہا کہ واقدی ثقہ نہیں، یعنی قابل اعتبار نہیں۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا! واقدی کذاب ہے، حدیثوں میں تبدیلی کر دیتا تھا۔ امام بخاری اور امام ابو حاتم رازی نے کہا کہ واقدی متروک ہے۔ مرہ نے کہا کہ واقدی کی حدیث نہ لکھی جائے۔ ابن عدی نے کہا واقدی کی حدیثیں تحریف سے محفوظ نہیں۔ ذہبی نے کہا واقدی کے سخت ضعیف ہونے پر ائمہ جرح التعدیل کا اجماع ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۲۵)

لہذا بارہ ربیع الاول کو وفات بتانے والی روایت ساقط ہے اس لیے قابل قبول نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کسی بھی طریقہ سے ۱۲ ربیع الاول کو ثابت نہیں ہوتی۔ تمام امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال مبارک سوموار کو ہوا۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۹۳، روایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اگر سوموار والے دن ۱۲ ربیع الاول بن جاتی ہے پھر تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۲ تاریخ سوموار کے دن کسی صورت نہیں بنتی کیونکہ حضور ﷺ نے حج فرض ہونے کے بعد زندگی میں ایک ہی حج ادا فرمایا۔ جس کو حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حج ۹ ذوالحجہ یوم عرفہ جمعۃ المبارک کو پڑھا گیا۔ جیسا کہ مسلم شریف ج ۲ ص ۳۲۰ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ لہذا ۹ ذوالحجہ بروز جمعۃ المبارک ۱۰ ہجری سے ۱۱ ہجری کے ربیع الاول تک کل تین مہینے ہیں۔ اور ۱۱ ہجری کے ربیع الاول میں سوموار والے دن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا۔ تو اگر ۹ ذوالحجہ بروز جمعہ سے گن کر ربیع الاول تک لایا جائے اور تینوں مہینوں کے چاند چاہے انتیس رکھے جائیں یا تیس یا جس طرح کوئی چاہے مگر سوموار والے دن کسی صورت ۱۲ تاریخ نہیں بنتی۔ اکابرین علماء دیوبند بھی اس بات پر متفق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں "بارہویں جو مشہور ہے وہ حساب درست نہیں ہوتا

کیونکہ اس سال ذوالحجہ کی نویں جمعہ کو تھی اور وفات دوشنبہ ثابت ہے پس جمعہ کو نویں ذوالحجہ ہو کر بارہ ربیع الاول دوشنبہ کو کسی طرح نہیں ہو سکتی"۔ (نشر الطیب ص ۲۴۱ حاشیہ)

اسی قانون کے تحت مولانا زکریا سہارنپوری فرماتے ہیں!"۱۲ ربیع الاول وفات کی تاریخ کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بعض محدثین نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا بلفظہ (خصائل نبوی شرح اردو شمائل ترمذی ص ۳۸۱ مطبوعہ لاہور)

مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں!"بالجملہ بودن دوازدھم ربیع الاول بروز دوشنبہ بوجہ من الوجوہ صحیح نمی تواند شدہ"۔ بارہ ربیع الاول بروز دوشنبہ وفات کئی وجوہ کی وجہ سے صحیح نہیں۔ (مجموعہ فتاوی عبدالحی لکھنوی ج ا ص ۳۵۲)

مفتی رشید احمد صاحب "ضرب مومن" ج ۵ شمارہ نمبر ۲۳، ۱۵ تا ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ مطابق ۸ تا ۱۴ جون ۲۰۰۱ء میں لکھتے ہیں!"اس میں صرف ۳ مہینے کا حساب ہے اور بالکل بدیہی ہے جسے عامی سا شخص بھی آسانی سے نکال لے۔ ذوالحجہ کی نویں تاریخ جمعہ کو تھی۔ اسکے بعد آپ ﷺ کی وفات تک صرف ۳ چاند بنتے ہیں۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ان کا حساب ان پڑھ سے انپڑھ بھی نکال سکتا ہے۔ تینوں چاند ۲۹ کے لگالیں تو پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول نہیں بنتی۔ دو انتیس کے لگائیں ایک تیس کا تو نہیں بنتی"۔

مولانا محمد حسین نیلوی دیوبندی (سرگودھا) نے بھی ۱۲ ربیع الاول کو وفات تسلیم نہیں کیا۔ دیکھئے: (ندائے حق ج ۱)۔

ان تمام اکابرین علماء دیوبند سے تو ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن نہیں بنی تو نئے آنے والے متاخرین نے کیسے بنالی؟۔ اسی قانون اور قاعدہ کو مختلف محدثین نے پیش فرمایا جس کے تحت بارہ ربیع الاول کو وفات نہیں بنتی اور یہی حقیقت ہے۔ ہاں اگر کوئی پیر والے دن ۱۲ ربیع الاول کو وفات ثابت کر دکھائے تو ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے دن کو رات ثابت کرنا۔

۱) اگر تینوں مہینے تیس کے مانے جائیں تو: ۵ ذوالحجہ کو سوموار بنتا ہے، پھر ۳ محرم کو سوموار بنتا ہے، پھر یکم صفر کو پیر بنتا ہے اور ۶ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۱۳ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔

۲) اگر تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں تو: ۵ ذوالحجہ کو پیر بنتا ہے، ۴ محرم کو پیر بنتا ہے، ۳ صفر کو پیر بنتا ہے، ۲ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۹ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔

۳) ۲ مہینے ۲۹ کے اور ایک ۳۰ کا ہو تو: ۵ ذوالحجہ کو پیر بنتا ہے، ۴ محرم الحرام کو پیر بنتا ہے اور ۳ صفر کو پیر بنتا ہے، یکم ربیع الاول کو پیر بنتا ہے، ۸ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۱۵ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔

۴) ۲ مہینے ۳۰ دن کے ایک مہینہ ۲۹ دن کا ہو تو: ۵ ذوالحجہ کو پیر بنتا ہے، ۳ محرم الحرام کو پیر بنتا ہے، یکم صفر کو پیر بنتا ہے، ۷ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۱۴ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔ مگر ۱۲ ربیع الاول کو کسی صورت پیر نہیں بنتا۔ تو معلوم ہوا کہ ۱۲ ربیع الاول کو وفات النبی ﷺ کہنا درست نہیں۔

مذکورہ قانون اور محدثین: اس قانون کے تحت محدثین و مؤرخین نے ۱۲ ربیع الاول کو حضور ﷺ کی وفات تسلیم نہیں کی ہے۔ ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱) حضرت العلام الامام السہیلی متوفی ۵۸۱ ھ نے یہ ہی قانون اپنی مشہور زمانہ کتاب ''الروض الانف'' ج ۲ ص ۳۷۲ مطبوعہ ملتان میں پیش فرمایا ہے۔

۲) اسی طرح حضرت علامہ امام نور الدین علی بن احمد السمہودی متوفی ۹۱۱ ھ نے اپنی کتاب ''وفاء الوفاء ج ا ص ۳۱۸ میں بیان فرمایا۔

۳) یہ قانون حضرت علامہ امام شمس الدین الذہبی نے ''جز السیرۃ النبویہ'' ص ۳۹۹، ۴۰۰ میں پیش کیا ہے۔

۴) امام ابن کثیر نے ''البدایہ والنھایہ ج ۵ ص ۲۰۶ طبع بیروت میں لکھا ہے۔

۵) امام علی بن برھان الدین الحلبی نے ''سیرت حلبیہ'' ج ۳ ص ۴۷۲ میں لکھا ہے۔

۶) یہی قانون امام یافعی نے اپنی کتاب ''مراۃ الجنان'' میں لکھا ہے۔

۷) یہ ہی قانون امام ابن رجب حنبلی دمشقی نے اپنی کتاب لطائف المعارف میں نقل کیا اور فرمایا! ''کان کذالک لم یصح ان یکون یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول''۔ (بحوالہ فتاوی عبدالحی ج ا ص ۳۰۱)

۸) اسی قانون کو امام عبداللہ محمد الزرندی المدنی نے اپنی کتاب ''اعلام بسیرۃ النبی علیہ السلام'' میں نقل فرمایا ہے۔ لہذا محدثین ومورخین کے نزدیک ۱۲ ربیع الاول رسول اللہ ﷺ کی وفات کا دن نہیں ہے۔

دیوبندی مکتبہ فکر کے سرکردہ عالم مفتی رشید احمد صاحب لکھتے ہیں! ''تو ربیع الاول کی ابتداء میں پیر کے دن جو تاریخیں صحیح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے اکثر نے ۲ ربیع الاول کو اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کتب تاریخ میں دراصل یوں لکھا تھا۔ ثانی **شهر ربيع الاول**: شہر مہینے کو کہتے ہیں یعنی ربیع الاول کی دو تاریخ۔ مگر بعد میں کسی ناقل سے لکھنے یا پڑھنے میں غلطی ہو گئی۔ اس نے اسکو اس طرح پڑھ لیا ''ثانی عشر ربیع الاول'' ثانی عشر کہتے ہیں ۱۲ کو۔ اصل لفظ ''شہر'' تھا اسے عشر پڑھ لیا گیا۔ اور اس طرح ۲ کا ۱۲ بن گیا۔ اور یہ غلط بات پھیل گئی۔ بعض نے اختلاف مطالع کی تاویل کی ہے جو کہ باطل ہے۔ (ضرب مومن ۱۵ تا ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۲ ہجری بمطابق ۸ تا ۱۴ جون ۲۰۰۱ء)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ۱۲ ربیع الاول حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کا دن نہیں بلکہ ۲ ربیع الاول کا دن ہے۔ اور ہم نے بھرپور دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ۱۲ کو وفات نہیں بلکہ ۲ ربیع الاول کو وفات ہے کیونکہ ۱۲ کو سوموار کا دن نہیں بنتا۔ سوموار کو حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ثابت ہے اور سوموار کو ۱۲ نہیں بلکہ ۲ ربیع الاول بنتا ہے۔ اللہ کریم حق بات تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

مدینے سے میدانِ کربلا تک

امام حسین رضی اللہ عنہ کی سواری

ابواُسامہ ظفر القادری بکھروی

جب بھی محرم الحرام کا مہینہ آتا ہے ماتمی جلوسوں میں "ذوالجناح" کا وجود ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں شامل گھوڑے کو "شعائر اللہ" کا درجہ دیدیا جاتا ہے۔ جو کہ تحقیقاً بے اصل ہے۔ عام واعظین اور ذاکرین اس کا تذکرہ بڑے مقدس انداز میں کرتے ہیں اور کربلا کے واقع کو بیان کرتے ہوئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے بارے میں مختلف ڈرامائی حکایات بیان کی جاتی ہیں جو کہ یقیناً اُن نفوسِ قدسیہ کے شایانِ شان ہرگز نہیں۔ اگر ہم بالغ نظری سے کتب شیعہ کا مطالعہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سید الشہداء جناب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اس سفر کے دوران اُونٹنی پر سوار تھے۔ آیئے ان کتب کے مختلف اوراق کی ورق گردانی کرتے ہیں:

۱) مدینے سے آغاز سفر اونٹنی پر اور کربلا میں اونٹنی: "ثم ان محمد ابن حنفیه سمع ان اخاه الحسین یرید العراق فبکی بکاء شدیدا ثم قال له ان اهل الکوفة قد عرفت غدرهم بابیک واخیک فان قبلت قولی اقم بمکة فقال یا اخی انی اخشی ان تقاتلنی جنود بنی اُمیه فی مکة فاکون کالذی یستباح دمه فی حرم الله ثم قال یا اخی فیسر الی یمن فانک امنع الناس به فقال الحسین علیه السلام یا اخی سا نظر فیما قلت فلما کان وقت السحر عزم علی المسیر الی العراق فاخذ محمد ابن الحنفیة زمام ناقته وقال یا اخی ماسبب ذالک انک عجلت "۔ (ذبح عظیم ص ۱۶۵ مطبوعہ کتب خانہ اثنا عشری لاہور) ترجمہ: جب محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے سنا کہ ہمارے بھائی جناب امام حسین رضی اللہ عنہ ملک عراق کی طرف تشریف لے جانے کا قصد رکھتے ہیں تو آپ زار و قطار روئے۔ پس آپ نے عرض کی اے بھائی آپ اہل کوفہ کے غدر کو اپنے پدر بزرگوار اور برادر عالی مقام کے ساتھ خوب جانتے ہیں۔ پس

اگر میری عرض پذیر فرمائیں تو مکہ میں قیام فرمائیں۔ جناب امام حسین نے فرمایا کہ مجھ کو خوف ہے کہ لشکر بنو امیہ مجھ کو مکہ میں قتل نہ کر ڈالے اور کہیں میں وہ شخص نہ ہوں کہ جس کا خون بہانا حرم محترم میں مباح ہو۔ محمد ابن حنفیہ نے کہا کہ آپ یمن کی طرف تشریف لے جائیں کہ وہاں کے لوگ مخالفوں کو آپ تک نہ آنے دیں گے۔ امام عالی مقام نے فرمایا کہ اے برادر عزیز اگر میں پتھر میں بھی سما جاؤں تاہم یہ بے دین مجھ کو وہاں سے نکال لیں گے اور مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ پھر امام حسین علیہ السلام نے فرمایا! اے بھائی جو تم نے کہا ہے میں اس میں غور کروں گا۔ مگر جب صبح ہوئی تو حضرت نے سفر عراق کا قصد مصمم فرما لیا۔ یہ خبر پا کر محمد بن حنفیہ آئے اور انھوں نے آپ کے ناقہ (اونٹنی) کی مہار پکڑ لی۔
معلوم ہوا کہ آپ مدینے سے روانہ ہونے لگے تو اونٹنی پر سوار تھے۔

۲) امام حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں اونٹنی پر: ''فقال علیه السلام هذه کربلا موضع کرب و بلاء و هذا مناخ رکابنا و محط رحالنا و مقتل رجالنا'' (کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ ۲/۴۷ مطبوعہ تبریز طبع جدید، مناقب ابن شہر آشوب ۴/۹۷ مطبوعہ قم طبع جدید)

ترجمہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی کربلا ہے اور یہی تکلیف وامتحان کا مقام ہے۔ ہمارے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ، ہمارے کجاوے اتارنے کا مقام اور نوجوانوں کی شہادت گاہ ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کربلا میں اونٹوں پر سوار تھے۔

۳) ''قال الحسین و ما اسم هذا المکان؟ قالوا له کربلاء قال ذات کرب و بلاء و لقد مر ابی بهذا المکان عند مسیره الی صفین و انا معه فوقف فسأل عنه فاخبر باسمه فقال ههنا محط رکابهم و ههنا مهراق دمائهم''۔ (الاخبار الطوال ص ۲۵۳ مطبوعہ بیروت طبع جدید) ترجمہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس جگہ کے بارے میں دریافت فرمایا۔ لوگوں نے عرض کی یہ کربلا ہے۔ فرمایا تکلیف وامتحان والی جگہ۔ میرے والد گرامی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) جنگ صفین کی طرف جاتے ہوئے اس جگہ سے گزرے۔ میں بھی آپکے ساتھ تھا۔ تو کچھ دیر ٹھہر گئے۔ اس جگہ کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ آپکو اس کا نام بتایا گیا تو فرمایا یہ جگہ ان کے اونٹوں کے بٹھانے کی ہے

اور یہ جگہ ان کے خون سے لت پت ہوگی۔

فائدہ: (۱) ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ اُونٹوں پر سوار تھے۔

۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علم لدنی سے یہ معاملہ ملاحظہ فرمایا اور بیان کیا۔

۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا اس کو من وعن ذکر کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ کربلا میں آپ گھوڑے پر سوار نہ تھے بلکہ اونٹنی پر سوار تھے۔

۴) اہل تشیع کے مستند ومعتبر مؤرخ اور تاریخ کربلا کے پہلے مصنف کا بیان: ''فقال الحسین واللہ لا اعطی بیدی اعطاء الذلیل ولا افر فرار العبید ثم تلا انی عذت بربی وربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب ثم اناخ راحلته وامر عقبة بن سمعان ان یعقلها بفاضل زمامها''۔ (مقتل ابی مخنف ص ۵۵ مطبوعہ حیدریہ نجف اشرف طبع قدیم) ترجمہ: امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم! میں ذلیل آدمی کی طرح اپنا ہاتھ (کسی کی بیعت میں) نہ دونگا اور میں غلاموں کی طرح راہِ فرار اختیار کروں گا۔ اور یہ کہہ کر آپ نے قرآنی آیت پڑھی: ''میں ہر متکبر سے تمہارے اور اپنے رب کی پناہ چاہتا ہوں، جو متکبر قیامت کا منکر ہے''۔ پھر امام حسین نے اپنی سواری بٹھائی۔ اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اس (اُونٹنی) کے پاؤں باندھ دے۔ تو اس نے بچی ہوئی نکیل کی رسی سے اُسے باندھ دیا۔

فائدہ: سواری صرف اونٹ کی بٹھائی جاتی ہے نہ کہ گھوڑے کی، اور پاؤں بھی اُونٹ کے باندھے جاتے ہیں نہ کہ گھوڑے کے۔ معلوم ہوا کہ اہل تشیع کے مستند مؤرخ نے بھی تسلیم کیا کہ امام حسین اُونٹنی پر سوار تھے۔

رِکَابٌ کا معنی: ۱) المنجد ص ۳۰۲ مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی میں ہے: رِکَابٌ۔ سواری کے اونٹ

۲) لسان العرب ۱/۴۳۰ مطبوعہ بیروت میں ہے: والرکاب. الابل التی یسار علیھا واحدتھا راحلة ولا واحدلھا من لفظھا. واجمعھا رکب بضمّ الکاف مثل کتب۔

ترجمہ: رکاب وہ اونٹ ہیں جن پر سفر کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا واحد راحلة ہے اور لفظ رکاب سے لفظی طور

پر اس کا واحد نہیں۔ اس کی جمع رکب بروزن کتب ہے۔

رِحالٌ کا معنیٰ: (۱) المنجد صفحہ ۳۵۷ طبع فرید بک ڈپو دہلی انڈیا میں ہے:

الرحال: کجاوہ بنانے والا۔ بہت سفر کرنے والا۔

الرحل۔ کجاوہ۔ پالان۔ الراحلۃ سواری کے لائق اُونٹ۔

۲) لسان العرب ۱/۴۷۲ مطبوعہ بیروت میں ہے:

الرحل: مرکب للبعیر والناقۃ وجمعہ ارحل ورحال ۔ ترجمہ: رَحْلٌ۔ اُونٹ اور اُونٹنی پر بیٹھنے اور سفر کرنے کے لیے بنائے گئے کجاوے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَرْحُلٌ اور رِحَالٌ آتی ہے۔

مقتل ابی مخنف کا بیان: فلما نظر الطرماح اخذ بزمام ناقۃ الحسین وانشاء یقول .

یاقتی لا تجزعی من زجری   وشمری قبل طلوع الفجر

بخیر رکبان وخیر سفر   حتیٰ تحلی بکثیر الفخر

(مقتل ابی مخنف صفحہ ۳۵۔ ۳۶ مطبوعہ نجف اشرف طبع قدیم)

ترجمہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جب میدان کربلا میں تشریف لے آئے تو حُر آپکی نگرانی کرتے ہوئے آپکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ایک اور محبّ "طرماح" نے جب امام موصوف کو آتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھا اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی اُونٹنی کی لگام ہاتھ میں تھامے معذرت کرتے ہوئے چند اشعار کہے۔

ترجمہ: اے میری اُونٹنی! میری ڈانٹ ڈپٹ سے پریشان نہ ہونا اور طلوع فجر سے قبل بہترین سوار کو لے کر بہترین سفر پر روانہ ہو جا یہاں تک کہ تو بہت بڑے فخر سے مزین ہو جائے۔

۶) اس واقعہ کو محمد بن علی ابن شہر آشوب نے بھی بیان کیا ہے لکھتے ہیں!

یا ناقتی لا تجزعی من زجری   وامض بنا قبل طلوع الفجر

بخیر فتیان وخیر سفر   آل رسول اللہ اہل الخیر

(مناقب ابن شہر آشوب ۴/۹۵ مطبوعہ قم طبع جدید)

ترجمہ: اے میری اونٹنی! میری ڈانٹ ڈپٹ سے پریشان نہ ہونا۔ ہمیں بہترین سواروں کے ساتھ طلوع فجر سے قبل یہاں سے بہترین سفر کی طرف لے چل۔ وہ بہترین سوار اللہ کے رسول کی آل ہیں۔ جو صاحب خیر ہیں۔

۷) تاریخ روضۃ الصفاء میں ہے:

''امام حسین فرمود۔ مرگ نزد من آسان تر است از ملاقات با ابن زیاد۔ بعد از اں فرمود تا شتراں بار کردند و مردم خود را سوار ساختہ روئے بجانب حجاز نہاد''۔ (تاریخ روضۃ الصفاء ۳/۱۷۹ مطبوعہ لکھنؤ) ترجمہ: جب حُر نے امام عالی مقام کو ''ابن زیاد'' کے پاس چلنے کا مشورہ دیا تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا! میرے لیے ابن زیاد کے ساتھ ملاقات کرنے کی نسبت جام شہادت نوش کر لینا آسان ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا: ساتھیوں! سامان اُنٹوں پر لادو۔ اور اپنے ساتھیوں کو سوار کر کے حجاز کی طرف روانہ ہو چلو۔

تفسیر لوامع التنزیل میں ہے:

''جاء الشمر فی قبیلة عظمة یقاتله ثم حال بینه و بین رحله ''۔ (تفسیر لوامع التنزیل ۱۳/۹۱) ترجمہ: شمر ایک بہت بڑی جماعت لے کر جنگ کیلیے آیا اور نواسہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپکی اُونٹنی کے درمیان حائل ہو گیا۔

ان سطور میں اھل تشیع کی مستند کتب کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ امام حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے روانہ ہوئے تو ان کے پاس اُونٹنی تھی۔ راستے میں بھی اُونٹنی پر سوار تھے۔ کربلا میں پہنچے تو اُونٹنی پر سوار تھے۔ اُترے تو اُونٹنی سے اُترے۔ شمر نے روکا تو اُونٹنی پر سوار تھے۔ تو گھوڑا کہاں سے آ گیا؟۔۔۔۔ یقیناً ''ذوالجناح'' کے تصور کو عام کرنے کیلیے اس جھوٹ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عزوجل سمجھ عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔!

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆